عقیدہ

اور

عقیدت

﴿تالیف﴾

حضرتِ مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب مدظلہ کربوغہ شریف

خلیفہ مجاز برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت اقدس حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نوّر اللہ مرقدہ

www.darulsman.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدِّمَة

الحمد لِلهِ و كفى والصلوة والسلام على خاتمِ الانبِيآءِ وعلى عِبادِهِ الذِين اصطفى،

اما بعد:

توحید وشرک اور محبت و تعظیم کے موضوع پر اردو زبان میں پہلے سے کتابیں موجود ہیں جن میں بعض حضرات کی زبان اور قلم جب توحید کے بارے میں چلنا شروع ہوتے تو قرنِ اول سے لے کر آج تک بڑے سے بڑا عالم، محدث، فقیہ یا صوفی بھی انہیں شرک سے خالی نظر نہیں آتا اور عہدِ رسالت سے آج تک کا تقریباً ہر مسلمان مشرک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اِسی طرح جب محبت کو تحریر وتقریر میں لایا جاتا ہے تو فروعی مسائل جیسے توسل وغیرہ کا انکار کرنے والوں کو بے ادب اور گستاخ باور کرایا جاتا ہے۔

اگر ہمارے اہل قلم خصوصا علماء کرام (جن پر امت کی اصلاح وتربیت کی ذمہ داری ہے اور اہلِ اسلام میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا اور مومنین میں بھائی چارہ کو فروغ دینا ان کا فرضِ منصبی ہے) پیار ومحبت سے اور نرم الفاظ استعمال کر کے'' و جا دِلھم بِالتِی ھِی احسن '' کو مدنظر رکھ کر ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے اور خالص علمی مسائل عوام اور کم استعداد لوگوں کے سامنے لانے اور ان کو ان باریک مسائل میں الجھانے سے گریز کرتے جیسا کہ ہمارے اسلاف کا شیوہ تھا تو بڑی حد تک اصلاح بین الناس میں کامیاب ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرات علماء کرام کسی کو کافر بناتے نہیں بتاتے ہیں تاہم اگر نرم الفاظ اور شریں سخنی سے دوسرے کو اپنا نظریہ پیش کیا جائے اور ٹھنڈے دل اور فراخدلی سے ان کی بات پر کان دھرے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی کا نظارہ پیش نہ کریں۔ جن جذبات کو غلط طریقہ سے اُبھار کر شیطان ہم میں نفرت وکدورت

www.darulemaan.com

پیدا کرتا ہے انہی جذبات کو اگر صحیح نصب العین کے حاصل کرنے میں صرف کیا جائے تو وہی سادہ لوح مسلمان ﴿رحماء بینھم﴾ کا منظر پیش کر سکتے ہیں۔فروعی مسائل میں ائمہ اہلسنت کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔مگر ان کا آپس میں نہایت بلند درجہ ادب و تعظیم سے پیش آنا بھی اظہر من الشمس ہے۔حضرت امام شافعی کا حضرت امام اعظمؒ کی شان میں ''الفقھأ عیال ابی حنیفة'' جیسے الفاظ سے رطب اللسان ہونا فقہ کے کسی ابتدائی طالب علم سے پوشیدہ نہیں اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں،غرض یہ کہ باوجود فروعی مسائل میں اختلاف کے ہمارے اسلاف کرام کا ایک دوسرے کا عزت واکرام کرنا اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

اس لیے ایک عرصہ سے یہ آرزو تھی کہ توحید اور محبت کے مضامین کو یکجا کر کے قدرے تفصیل اور وضاحت سے افراط وتفریط سے پاک نقطہ نظر پیش کیا جائے اور اختلافی مسائل جیسے دست بوسی،قیام اور توسل کے متعلق ایسے انداز سے لکھا جائے کہ قائلین اور منکرین کے موٹے موٹے دلائل مختصر طور پر قارئین کے سامنے آجائیں تاکہ اوسط طریق اور مسئلہ کی نوعیت خود بخود واضح ہو جائے اور فروعی مسائل میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ اختلاف برائے اختلاف کو چھوڑ کر کل مومن اِخوة کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے خواہ مخواہ کسی مسلمان کی توہین وتکفیر نہ ہو اور نہ ہی کسی مسلمان کو مبتدعین ومشرکین کی صف میں کھڑا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور مسلمانوں کے لیے اسے مفید فرمائے اور ما ارِید الِاصلاح ماا ستطعت کا مصداق بنائے۔

و آخِر دعوانا انِ الحمد للہِ ربِ العالمِین و صلی اللہ تعالیٰ علی خیرِ خلقِہ سیدِناومولٰنا محمد و الِہ واصحابِہِ واتباعِہ اجمعِین برحمتِك یاارحم الراحِمین.(آمین)

بندہ مختارالدین

www.Qaricean.com

www.daruleeman.com

باب اول

شرک کی حقیقت اورانواع!

انبیاءعلیہم السلام کی تعلیم!

اللہ تعالیٰ وتبارک کی ہستی ایک ایسی ظاہر و بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شک یا انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔کسی کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہوگئی ہوتو اس کے لیے اللہ رب العزت کی ذاتِ عالی پریقین فطرتی طور پر بالکل ایسا ہی واضح اورعیاں ہے جیسے کہ خود اپنی ہستی کا وجود۔ یہاں تک کہ اگر بظاہر انکار کرنے والوں کے اندرون کو بھی ٹٹولا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کی ہستی کا اقرار پوشیدہ طور پر موجود ہے۔لیکن اللہ جل شانہ کی وحدانیت کا مسئلہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں بیشمار قومیں گمراہ ہوئی ہیں اس لیے دنیا میں جتنے انبیاعلیہم السلام تشریف لائے ہیں،ان سب کی دعوت کا آغاز عقیدہ توحید ہی سے ہوتا ہے اوران میں سے ہرایک نے شرک کے مٹانے پر اپنی پوری قوت صرف کردی۔

شرک کی ابتدا!

شرک کی ابتدا کے بارے میں عبدالشکور سالمی اپنی کتاب التمہید میں جو کچھ فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرک کی ابتدا اورظہور حضرت اخنوخ علیہ السلام جن کو حضرت ادریس علیہ السلام کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے کے وقت سے ہوئی۔اس سے پہلے مخلوق نے کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا۔البتہ بعض افراد انفرادی طور پر معصیت اورنافرمانی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے

www.darulemaan.com

بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا۔

حضرت ادریس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو علوم و ہدایات کے ساتھ بطور معجزہ نجوم اور رمل کا علم بھی دیا گیا تھا۔ ان کے بعد ان کے چند شاگرد اور خاص تلامذہ جن میں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نصر شامل تھے۔ ان کی قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ جب حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تو یہ پانچوں حضرات شب و روز عبادت اور لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔ جب یہ ہستیاں بھی اس عالم سے تشریف لے گئیں تو قوم پریشان ہوئی کہ اب کس سے احکام دین سیکھیں اور رہنمائی حاصل کریں۔ پھر ان میں سے بعض ا؎ نے مشورہ کیا کہ اِن بزرگوں کے مجسمے بنا لیے جائیں تاکہ ان کو دیکھ کر ان حضرات کی یاد تازہ رہے اور ان کی تعلیمات و ہدایات اور طور طریقے بھولنے نہ پائیں۔ قوم نے ایسا ہی کیا اور مجسمے تیار کر کے ان کے نام بھی وہی تجویز کیے جو ان حضرات کے تھے۔

ابتداء میں یہ لوگ عبادت تو خدا ہی کی کرتے تھے اور ان مجسموں کو صرف یاد تازہ کرنے کے لیے دیکھ لیتے تھے، لیکن ان کی اولاد کے لیے شیطان نے شرک و بت پرستی کے لیے میدان ہموار کر دیا کیونکہ انہوں نے اپنے آباء و اجداد کے عمل کو دیکھا تھا اور جب آباء و اجداد کی نسل گزر چکی تو شیطان ان کی اولاد کے پاس آیا اور ان مجسموں میں داخل ہو گیا اور انہی بتوں کے ذریعہ سے اس نے یہ اعلان کیا کہ اے لوگوں! میں تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہوں اور تمہارے آباء و اجداد میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ چونکہ اولاد کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ ان کے آباء و اجداد تو بتوں کی عبادت نہیں کرتے تھے

ا؎ ((عن ابن عباس صارت الاوثان التی كانت فی قوم نوح فی العرب بعد اسماء رجال صالحین قوم نوح فلما هلكوا اوحی الشیطان الی قومهم ان انصبوا الی مجالسهم التی كانو ایجلسون انصابا و سموها باسما ئهم ففعلوا فلم تعبد حتی اذ ملك .))

www.urdueman.com

(بلکہ صرف تعظیم وتکریم کرتے تھے) اس لیے شیطان ان کو گمراہ کرنے میں بآسانی کامیاب ہو گیا غافل ونادان قوم نے ان بتوں کی تعظیم وتکریم کے ساتھ جب ابلیس کی ندا کو سنا تو یہ بات پوری طرح قلب ودماغ میں راسخ ہو گئی کہ دراصل یہی مورتیاں ان کے معبود ہیں اور ان مجسموں کو پیتل، چاندی اور سونے سے تیار کرنے لگے اور شرک وبت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ [1] اور بدستور ان بتوں کی عبادت کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا کہ وہ ان مشرکوں کو خالقِ حقیقی کی عبادت اور توحیدِ اصلی کی طرف دعوت دیں۔ انہوں نے اپنی قوم کو دینِ حق کی طرف بلایا لیکن انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ: ﴿لا تذرن الِھتکم ولا تذرن ود او لا سواعا ۷ و لا یغوث ولا یعوق ونسرا ﴾ (سورۂ نوح)

''ہرگز نہ چھوڑ واپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑ وودا اور سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو۔''

---

[1] امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن عساکرؒ نے حضرت شیث علیہ السلام کے حالات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی چالیس اولادیں تھیں بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں۔ لڑکوں میں سے ہابیل وقابیل، صالح، عبدالرحمٰن اور ود زندہ رہے سواع، یغوث، یعوق اور نسر انہی کے بیٹے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر: ص:۴۲۶ ج:۴)

علامہ سید محمود آلوسی لکھتے ہیں ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ پانچوں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ان سب میں بڑا اور سب سے نیک ود تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں سب سے پہلے ود کو شریک کیا گیا (روح المعانی: جزء:۲۹)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو اہل عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے بھی ہوں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں۔ نسر کے متعلق تو یہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ (تاریخ ارض القرآن کامل:۴۱۹)

www.qurueman.com

اور باوجود یہ کہ نوح ؑ ساڑھے نوسو سال تک سمجھاتے رہے، وہ لوگ ان کی اطاعت سے انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ سخت افسوس و یاس کے عالم میں فرمانے لگے:

﴿رب لا تذر علی الارضِ مِن الکفٰرِین دیارا﴾

''میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔''

(کیونکہ ان پر یہ بات صاف طور پر کھل چکی تھی کہ نہ صرف وہ لوگ سڑے ہوئے اعضاء کی طرح بالکل تباہ ہو چکے تھے بلکہ ایمان والوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی بدکار اور کافر ہوگی۔ مسلمانوں کی اولاد کو گمراہ کریں گے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے ان بدقسمت مشرکین کو غرق کر دیا اور کشتی نوح علیہ السلام میں زندہ و سلامت رہنے والوں میں نوح ؑ کی اولاد سام، حام اور یافث مع اپنے اہل و عیال کے باقی رہے جن سے آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے علاوہ وہ پانچ بت یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر بھی مٹی میں دب گئے تھے بعد میں شیطان نے انہیں دوبارہ قبیلہ غطفان کے لوگوں کے لیے آشکارا کر دیا۔

انہوں نے بتوں کی تعداد میں اتنا اضافہ کیا کہ وہ تین سو ساٹھ تک پہنچ گئے اور اسی طرح مشرکین بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ بعض کہتے تھے کے فرشتے (العیاذ باللہ) اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بعض کا دعویٰ تھا کہ ان کے بت خدا کی بیٹیاں ہیں اور بعض انہیں خدا تعالیٰ کی خدائی میں شریک سمجھتے تھے۔ ان فرقوں میں سے ایک فرقہ ایسا تھا جو نہ تو فرشتوں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے تھے اور نہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ بت ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت اور سفارش کرتے ہیں۔ اس لیے جب یہ بت ہم سے خوش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ہم سے راضی ہوگا اور یہ لوگ (اسی کے لیے) انہی بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ (التمہید لابی الشکور السالمیؒ: ٢٠٦ تا ٢٠٨)

www.tariqeiman.com

غرض جب لوگوں نے تعظیم وعقیدت میں اعتدال کو چھوڑ کر غلو اور حد سے تجاوز کیا تو یہیں سے شرک وگمراہی کا آغاز ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلی امتوں میں ایسا ہی ہوا کہ جن ہستیوں کے ساتھ ان کی عقیدت تھی ان کے بت اور مورتیاں انہوں نے اس خیال سے بنائی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کے وسیلے سے اللہ سبحانہ وتعالی کے ہاں رسائی ہوگی۔ مگر بڑھتے بڑھتے انہوں نے خود انہی ہستیوں کو معبود بنالیا، انہی کو مدد کے لیے پکارنے لگے، اور انہی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحبِ تصرف اور خدائی اختیارات کے مالک ہیں۔ ہماری فریادرسی ومشکل کشائی یہی کریں گے، اس گمراہی سے نکالنے کے لیے اللہ تعالی نے اپنی آیات اپنے بندوں کے ذریعہ بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

شرک کیا ہے؟

شرک حصہ داری یا شراکت کو کہتے ہیں اور اسلام میں شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کی، ذات یا اس کی صفات یا اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو خاص حقوق ہیں، ان میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اللہ کی ذات میں شرک یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات اور اس کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مانا جائے یا کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کر کے اسے اللہ تعالی کا جز قرار دیا جائے۔ مثلاً مجوس دو خدا مانتے ہیں۔ ایک یزدان اور دوسرا اہرمن یا جیسے نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک یہ ہے کہ اس کی مخصوص صفات جیسے خالق ہونا، رازق ہونا، فاعل مختار ہونا، علیم، خبیر ہونا اور عالم الغیب ہونا وغیرہ، غرض اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم!

یاد رہے کہ دوسری صفاتِ کمالیہ کی طرح علم بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے جس میں کوئی اس کا سہیم وشریک نہیں۔ جس طرح تمام مخلوق اللہ تعالی کی دوسری صفاتِ کمالیہ سے عاری اور کوری تھی، اسی

www.iqrameman.com

طرح تمام مخلوق انس وجن اور فرشتے بھی اصل میں بالکل بے علم تھے۔ان کو جو کچھ بھی علم حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ کے دینے سے حاصل ہوا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام کائنات میں ایک انسان ہی صرف ایسا ہے جسے پیدائشی طور پر قوت ارادی کے ساتھ علم کی استعداد وقوت بھی دوسری مخلوقات سے زیادہ اور پورے کمال کے ساتھ دی گئی ہے۔چنانچہ وہ ظاہری حواس خمسہ (آنکھ، کان، ناک، زبان اور چھونا) سے قابل احساس چیزوں کا ادراک کر کے عقل وفکر اور وجدان کے ذریعے مخفی امور معلوم کرتا ہے۔وہ آنکھ سے صورتوں کا علم، کان سے آوازوں کا علم، زبان سے ذائقوں ناک سے خوشبو یا بدبو اور ہاتھ پیر تمام بدن کے چھونے سے کسی چیز کی سختی، نرمی، گرمی اور ٹھنڈک کا ادراک کر کے اپنے دماغ میں جمع کر لیتا ہے اور عقل وفکر جو دماغ میں رچی ہوئی ہے وہ قلب (یعنی دل جو حکمران اور تمام علوم کا سرچشمہ ہے) جنبش اور اشارہ سے دماغ میں امور معقولہ کو خاص شعور کے ساتھ اخذ کر کے جمع کر لیتا ہے۔پھر وہ نہ صرف ان محسوسات کی صورت ومعنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے، بلکہ اس کیساتھ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کا تفصیلی تجزیہ کرتا ہے اور اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے اپنے اوپر کھول لیتا ہے۔کبھی وہ ان جزوی صورتوں کے استقرا وتتبع سے کوئی کلیہ بنالیتا ہے اور اس سے نئی جزئیات پیدا کرتا ہے اور کبھی وہ کسی جامع علت کی بنا پر ایک چیز پر دوسری چیز کو قیاس کر کے ایک حکم دوسری جزئیات اور چیزوں تک پہنچا دیتا ہے۔اسی طرح اور کئی جزئیات اور چیزیں پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔اسی طرح وہ کبھی ایک جزئی سے علمی نکات ولطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کو حاصل کرتا ہے۔

غرض انسان اپنے بیرونی واندرونی حواس اور عقل کے ذریعے وہ علوم حاصل کرتا ہے، جسے دیکھ کر حضرات ملائکہ بھی اس کی علمی استعداد اور تبحر علمی کے معترف ہوجاتے ہیں۔

لیکن جس طرح انسان میں اللہ تعالیٰ کی ان دی ہوئی قوتوں اور استعداد سے انکار نہیں، اسی

www.urdueman.com

طرح اس سے بھی انکار نہیں کہ علم [1] اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔جس کا پرتو عارضی طور پر انسان پر پڑتا ہے۔اور اللہ تعالی جس مرحلے پر ہر انسان کے لیے جو دروازے جس قدر کھولنا چاہے، وہ اس پر اس قدر کھول دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ وإن من شيء إلا عند نا خزآئنه وما ننزله الّا بقدر معلوم﴾

''ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک مقرر مقدار سے نازل کرتے ہیں۔''

عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے!

اس لیے مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب (غیب کا علم جاننے والا) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض وقت انسان کسی چھپی ہوئی چیز کو دریافت کر لیتا ہے لیکن یہ علم غیب نہیں بلکہ ایک مغالطہ ہے جو عام لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام لفظ غیب سے مراد لغوی معنیٰ لیتے ہیں یعنی ہر وہ چیز جو ان کے علم ونظر سے غائب ہو خواہ دوسروں کے نزدیک اس کے علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں۔ وہ اس کو غیب کہنے لگتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں۔اس لیے ضروری یہ ہے کہ اس غیب کو سمجھ لیا جائے جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کہا جاتا ہے۔

---

[1] یہاں علم اور علم کی استعداد وقوت میں فرق کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو علمی استعداد وقوت دیتا ہے لیکن انسان علم سے پیدائشی طور پر کورا ہوتا ہے۔

www.dawaheman.com

غیب کی اقسام!

غیب کے معنی مخفی اور پوشیدہ کے ہیں اور کسی چیز کے مستور ہونے کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔

اس کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ مادی دنیا میں موجود ہو، چاہے زمین پر ہو یا اس کے اندر ہو، یا چاند یا دوسرے سیاروں وغیرہ میں۔تو یہ چیزیں ایسی ہیں جن میں بہت سی چیزیں فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ایک چیز ہمارے سامنے ہے لیکن دوسرا شخص جو اس سے کچھ فاصلہ پر ہے اس سے غائب۔ایک چیز کسی جگہ موجود ہے۔ایک ہی جگہ پر دو شخصوں میں سے ایک اس کو اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتا ہے اور دوسرا شخص نظر کی کمزوری کی بناء پر نہیں دیکھ پاتا، یا چند اشخاص ایک ہی جگہ ہیں۔ ان میں ایک شخص اعلیٰ قسم کے دوربین کے ذریعے سینکڑوں میل دور کسی چیز کو دیکھ رہا ہے اور اس چیز کے بارے میں دوسروں کو خبر دے رہا ہے اور دوسرے اشخاص اس چیز کے عینی مشاہدے سے محروم ہیں۔

اسی طرح ایک شخص خوردبین کے ذریعے ایک قطرہ پانی میں لاکھوں جراثیم اور وائرس کی نقل وحرکت اور ان میں مختلف قسم کے جراثیم کی پہچان اور امتیاز کرتا ہے اور دوسرے عام لوگ اس کی اس خبر کو افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔یہی حال زمین کے اندر مخفی اشیاء اور خزانوں کا ہے، چاند اور دوسرے سیاروں میں موجود چیزوں کا ہے۔کوئی اللہ تعالیٰ کی ودیعت کی ہوئی تیز حس (خواہ ظاہری حس ہو یا باطنی کے واسطے سے یا کسی آلے اور تجربہ یا کسی ذریعے سے کچھ چیزیں معلوم یا محسوس کرتا ہے، اور کوئی اس سے کورا اور بے خبر ہوتا ہے۔اس قسم کی ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو غیب نہیں کہا جاتا یہ چیزیں ساری کی ساری موجود ہیں جنہیں کوئی محسوس یا معلوم کرتا ہے، کوئی نہیں۔یعنی بعض کے ادراک میں آتی ہیں اور بعض کے نہیں۔

دوسری قسم پوشیدہ چیزوں کی یہ ہے کہ جن کا ظہور تام اب تک نہ ہوا ہو البتہ اس چیز کا مادہ اور اس کے بعض اسباب کا ظہور ہوا ہو یا اس چیز کے دنیا میں آنے کے قرائن موجود ہوں جن کو عام لوگ نہیں جان سکتے۔ البتہ اہل فن اس کو معلوم کر لیتے ہیں۔جیسے ماہر فلکیات سورج کی رفتار کا اندازہ لگا کر پہلے سے بتا دیتے ہیں

www.darulqalam.com

کہ مثلاً فلاں دن پانچ بجے سورج طلوع ہوگا اور چھ بجے غروب۔ اور فلاں دن پانچ بج کر دس منٹ پر طلوع آفتاب ہوگا اور پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر غروب ہوگا۔ یا کوئی حساب لگا کر کہتا ہے فلاں ماہ فلاں تاریخ کو سورج گرہن یا چاند گرہن ہوگا۔ جیسا کہ جنتریوں اور اوقات کے نقشوں میں یہ معلومات ہمیں ملتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ ایک محسوس اور معلوم چیز کی رفتار سے اندازہ لگانا ہوتا ہے جیسا کے ائیر پورٹ والے ہمیں جہازوں کی آمد اور اسٹیشن والے ریلوں وغیرہ کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ ان جیسی تمام اشیاء کا تعلق حساب سے ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح ماہرین موسمیات بارش وغیرہ کے متعلق پیشنگوئی کرتے ہیں۔ ماہرین طب ونفسیات نبض دیکھ کر یا کسی آلے کے ذریعے معائنہ کر کے مریض کی چھپی ہوئی حالت بلکہ اس پر آئندہ آنے والی کسی بیماری کی خبر دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ خبریں پیشنگوئی کے مطابق واقع بھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین موسمیات یا ڈاکٹر وغیرہ کو ایسی خبریں دینے کا موقع اس وقت ہاتھ آتا ہے جب ان واقعات اور حالات کا مادہ اور ان کے بعض اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ماہرینِ موسمیات مون سون کا رخ اور اس کی قوت ورفتار کو دیکھتے ہیں تو وہ ان سے اندازہ کر کے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ بادو باراں یا گرج چمک کا امکان ہے اور فلاں فلاں جگہ موسم خشک رہے گا۔ اور یہی حال ڈاکٹروں اور طبیبوں کا ہے۔ وہ کسی شخص میں کسی بیماری کے جراثیم دیکھ لیتے ہیں۔ یا کسی بیماری سے دوسری بیماری لگ جانے کا تجربہ ان کو ہوتا ہے یا اسی طرح دوسرے ذرائع سے کسی آنے والے مرض کا مادہ معلوم کر کے خبر دیتے ہیں۔ غرض محکمہ موسمیات والے ہوں یا ڈاکٹر ہوں جتنے بھی ماہرین فن ہیں وہ کسی چیز کے بارے میں اطلاع تب دے سکتے ہیں جب ان واقعات کا مادہ اور اسباب ظاہر ہوں، اگر چہ اس چیز کا وجود منظر عام پر نہ آسکا ہو اور عوام اس سے بے خبر رہتے ہوں اور جب وہ مادہ قوی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا ہے۔ تو ایسی چیزیں جن کے وجود میں آنے کا مادہ موجود ہو چکا ہو۔ یا کسی چیز کے اسباب وآثار اور نشانات اہل فن کے نزدیک ظاہر ہو چکے ہوں تو وہ چیزیں پردہ غیب میں نہیں رہتیں۔ بلکہ ایک گونہ ظہور ان کا ہو چکا ہوتا ہے لیکن ان کی لطافت یا کمزوری کی وجہ سے عام مشاہدہ

www.urdukeman.com

میں ابھی نہیں آئیں۔اس کے علاوہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ اور اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔علم جو یقین کا نام ہے وہ ان میں کسی چیز کو حاصل نہیں البتہ جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں ان کا علم اگر چہ علم ہے مگر وہ غیب نہیں۔کیونکہ اس فن سے کسی موجود اور محسوس چیز کا رخ، رفتار اور اس کی قوت سے حساب لگا کر اس کی آمد اور منظر عام پر آنے کا وقت متعین کیا جاتا ہے جیسا کہ چاند گرہن وغیرہ کے اوقات متعین کیے جاتے ہیں۔

مستور چیزوں کی تیسری قسم وہ ہے جن کا تعلق اس مادی عالم سے نہیں بلکہ ان چیزوں کا محل ومقام عالم مثال [1] ہے یہ چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک ظاہری حواس اور آلات سے نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ چیزیں بھی اس لئے غیب میں داخل نہیں کہ جو چیزیں پردہ غیب سے عالم مثال میں آجاتی ہیں ایسی چیزیں اگر چہ ہماری نظروں سے غائب ہوتی ہیں لیکن وہ چیزیں عالمِ ملکوت میں ملائکہ کے سامنے ہوتی ہیں اور ہم بھی بعض اوقات کسی آنے والے واقعہ کو نورانی خواب کے ذریعہ عالم مثال میں دیکھ لیتے ہیں اور بعد میں وہ واقعہ جوں کا توں یا صحیح تعبیر کے موافق ظہور میں آجاتا ہے اسی طرح اہلِ کشف بیداری کی حالت میں روحانی تجلی میں بعض اشیاء کا ادراک کرتے ہیں اور یہ کسی ولی اللہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اشراقی [2] اور اہل ریاضت بھی کبھی بعض چیزوں سے واقف ہوجاتے ہیں لیکن خواب، مکاشفہ وغیرہ

---

[1] عالم مثال ایک عالم ہے جو عالم ارواح عالم اجسام کے درمیان بتایا جاتا ہے بعض علما اس عالم کو مانتے ہیں اگر کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو تیسری قسم سے وہ مستور چیزیں مراد ہوں گی جن کا خروجِ پردہ غائب سے ہو چکا ہو لیکن اس عالم اجسام میں موجود نہ ہوں۔

[2] اشراقیت اور روحانیت عقل پرستی کے خلاف ایک طبعی رد عمل ہے۔جس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ حق اور یقین کے دریافت کے لیے حواس، عقل اور علم قیاس وغیرہ قطعاً مفید نہیں ہیں بلکہ مضر ہیں۔صداقت اور حقیقت کے یقینی حصول کے لیے مشاہدہ شرط ہے اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفائی نفس (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں قوت وہمیہ کی آمیزش اس علم ویقین کوظن میں تبدیل کر دیتی ہے۔اس لئے سوائے انبیاءعلیہم السلام کے کشف کے جس قدر طریقے ہیں ان میں غلطی کا احتمال علی المراتب باقی رہتا ہے۔کسی میں اگر غلطی کا احتمال زیادہ ہے تو کسی کے کشف میں غلطی کا احتمال کم ہے۔لیکن وہ غلطی کے احتمال سے پاک نہیں۔اس لیے اس جاننے کو علم بمعنی یقین نہیں کہہ سکتے۔البتہ انبیاعلیہم السلام کو جو کشف ہوا کرتا ہے اس کے آگے پیچھے ملائکہ کا پہرہ ہوا کرتا ہے جس کی وجہ سے شیاطین کی قوت وہمیہ وخیالیہ اور عادات وطبائع وغیرہ اس پر کچھ وغیر اس پر کچھ دست اندازی نہیں کر سکتے اور وہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک صاف ہو کر انبیاءعلیہم السلام کو دکھائی دیتے ہیں۔اس لئے ان کے مکاشفات اور خوابیں بھی وحی کی اقسام میں سے ہوتے ہیں، جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ:۱۴) اور ایک ایسے اندرونی حاسہ کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے جو روحانیت اور ماورا الطبیعات کا اس طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری حواس ظاہری چیزوں کا ادراک کرتے ہیں یہ حاسہ اسی وقت بیدار ہوسکتا ہے جب مادیت کو فنا اور ظاہری حواس کو مردہ کر دیا جائے حقائق کی تحصیل اس حکمت اشراق اور نور باطن سے ممکن ہے جو ریاضتوں، نفس کشی اور مراقبہ تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے پاس ایسا باطنی اور اندرونی حاسہ ہے جس کو اگر وہ بیدار کر لے اور ترقی دے تو اس اقلیم کے بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے۔جن کا ادراک کسی حاسہ ظاہری سے ممکن نہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے بلکہ ممکن ہے۔کہ ایسے اور دوسرے حواس بھی ہیں۔لیکن بہر حال یہ بھی حواس ہی ہیں جو اس طرح کمزور اور محدود ہیں جس طرح دوسرے حواسِ ظاہرہ۔اور اسی طرح خطا پذیر اور متاثر ہونے والے جس طرح انسان کی دوسری طاقتیں ورنہ اس کے نتائج میں تعارض اور تناقص نہ ہوتا۔اس میں شک واحتمال نہ پیدا ہوتا اور بڑے بڑے اہم مسائل میں خطا اور غلط روی ممکن نہ ہوتی۔بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حاسہ کے محسوسات اور اس علم کی تحقیقات میں اس سے کہیں زیادہ تعارض واختلاف ہے جتنا کہ حواس ظاہری کے محسوسات میں واقع ہوتا ہے اور اہل کشف واشراق کے علوم وتحقیقات میں اتنا تناقص اور تعارض ہے جس کی نظیر شاید عقلیت میں مل سکے۔

www.maktabah.org

کہ اولیاء کرام کے مکاشفات اور الہامات میں محافظت نہیں ہوتی، اس لئے ان کو قرآن وسنت پر پرکھا جاتا ہے۔ ان کے مکاشفات اور خوابیں بھی وحی کی اقسام میں سے ہوتے ہیں، جب کہ اولیاء کرام کے مکاشفات اور الہامات میں محافظت نہیں ہوتی، اس لئے ان کو قرآن وسنت پر پرکھا جاتا ہے۔ ان کے مکاشفات اور الہامات ظنی اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے لوگوں پر حجت قاطعہ نہیں ہوتے اور نہ ان پر دوسرے مسلمانوں کو پابند کیا جاتا ہے۔

غیب کی چوتھی قسم آئندہ آنے والے ایسے واقعات ہیں جن کو نہ اللہ تعالیٰ نے اب تک اس دنیا میں پیدا کیا ہے اور نہ ان اشیا کے آثار ونشانات کو اس مادی عالم میں بھیجا ہے اور نہ ان کا ورود عالم مثال میں ہوا ہے یہ ایسے تکوینی واقعات ہیں اور ایسی غیبی تکوینیات [۱] ہیں جن پر غیب کے معنی صادق آتے ہیں اور تکوینیات سے یہ ایسے غیبی امور ہیں جن کا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو علم نہیں، البتہ ایسے آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا جزوی علم ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندے نبی مرسل کو بذریعہ وحی بتا دیتے ہیں جیسا کہ قیامت کا آنا، حساب وکتاب کا ہونا، دوزخ جنت کے حالات اور دنیا میں آنے والے واقعات کی پیشینگوئیاں [۲] لیکن ایسی صورت میں جب کہ اللہ تعالیٰ آنے والی چیزوں کی اطلاع اپنے کسی خاص بندے کو کر دیتے ہیں تو وہ چیزیں غیب نہیں رہتیں بلکہ وہ غیب کی خبریں ہو جاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پہنچا دیتے ہیں۔

---

[۱] تکوینی امور وہ تمام حالات و واقعات ہیں جن کا تعلق قیامت سے یا کائنات میں آنے والے واقعات سے ہے مثلاً یہ کہ کون کب پیدا ہوگا، کہاں پیدا ہوگا کیا کیا کام کرے گا کتنی عمر ہوگی اور عمر میں کیسے حالات سے گزرے گا وغیرہ۔

[۲] جیسے امام مہدی کا آنا، دجال کا آنا، حضرت عیسی علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا، دجال کی ہلاکت ان کے ہاتھوں سے ہونا، سورج کا مغرب سے نکلنا وغیرہ۔

www.darulfeman.com

یہاں تک تو مستور چیزیں بیان ہوئی ہیں جن کا تعلق تکوینیات سے تھا جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ ان امور میں سے صرف جزئیات اور بعض واقعات و حالات کا علم اللہ تعالی اپنے بندوں کو کسی ذریعے سے ضرورت کے مطابق بتا دیتے ہیں۔لیکن ان امور غیبیہ کی کلیات اور ان کے تمام علم تک کسی مخلوق کی رسائی ناممکن ہے خواہ ملک ہو یا نبی مرسل۔جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿و عِندہ مفاتِح الغیبِ لا یعلمھاالا ھوو یعلم ما فِی البرِ و البحرِ ط وما تسقط مِن ورق اِلا یعلمھا ولا حبہ فِی ظلماتِ الارضِ ولا رطب و لا یابِس اِلا فِی کِتاب مبِین﴾(انعام:۵۹)

یعنی''اس کے پاس غیب کی چابیاں ہیں (یعنی وہی غیب کے ذخیروں کا مالک ہے)انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا جو کچھ خشکی میں اور جو سمندروں میں ہے سب سے وہ واقف ہے، درختوں سے کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ (اللہ تعالیٰ) اسے جانتا ہے، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ نہیں اور کوئی خشک وتر چیز نہیں مگر (یہ کہ سب کچھ) ایک کھلی اور واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿قل لااقول لکم عِندِی خزآئِن اللہِ و لا اعلم الغیب ولااقول لکم اِنی ملک ج اِن اتبِع اِلاما یوحی اِلیط قل ھل یستوِی الاعمی والبصِیر افلا تتفکرون﴾(انعام:۵۰)

یعنی''اے پیغمبر آپ (ان لوگوں سے) کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالی کے خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا علم رکھتا ہوں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو فقط اسی بات پر چلتا ہوں جو مجھ پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) وحی کی جاتی ہے (اور اس کی طرف تمہیں بھی بلاتا ہوں) پھر ان سے پوچھو کیا اندھا (جس کو حقیقت کا کوئی علم و یقین نہیں) اور آنکھوں والا (جو حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے۔''

www.darulemaan.com

غیب کی پانچویں قسم!

غیب کی پانچویں قسم وہ ہے جس سے اللہ تعالی کی ذات وصفات کا اور اس کی پسند و ناپسند کا علم حاصل ہوتا ہے۔ احکامات کا علم جس میں عقائد، اعمال، معاملات، معاشرت اور اخلاق غرض پوری زندگی (خواہ) انفرادی ہو یا اجتماعی میں اللہ کی مرضیات اور غیر مرضیات سے واقفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جسے کوئی مخلوق انسان وغیرہ خواہ کتنا ہی ذہین وفہیم ہو اس کی ریاضت اور روحانیت کا پایہ کتنا بلند ہو، اس کا باطن کتنا روشن ہو اسے نہیں جان سکتا نہ اپنے حواس سے، نہ قوت شعور سے، نہ فراست سے، نہ قیاس سے، نہ عقل سے، نہ نور باطن سے، نہ آلات سے البتہ خداوند عالم جو عالم الغیب ہے وہ خود اسے اپنے برگزیدہ بندوں اور انبیاء ورسل کو عطا فرماتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آتا ہے۔

﴿قل اِن ادرِی اقرِیب ما توعدون ام یجعل له ربِی امدا o عالِم الغیبِ فلا یظهِر علی غیبِه ا حدا o اِلا مـنِ ارتـضـی مِـن رسـول فـاِنه یسلك مِن بینِ یدیهِ ومِن خلفِه رصدا o﴾ (الجن: ۲۵ تا ۲۷)

یعنی ''(اے پیغمبر آپ ان سے) کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ جس) عذاب (کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ نزدیک ہے یا میرا رب اس کے لیے لمبی مدت مقرر فرماتا ہے وہی عالم الغیب ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا مگر جس رسول کو (اس کام کے لیے) پسند فرمالے، تو اس کے آگے اور پیچھے محافظ بھیج دیتے ہیں۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مشرکین مکہ اور کفار نے آپ ﷺ سے قیامت اور عذاب کا معین وقت بتلانے پر اسرار کیا تو اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ قیامت کا آنا وہاں جزا وسزا کا ہونا تو یقینی ہے لیکن قیامت اور عذاب کے وقوع کی متعین تاریخ اور مدت کون سی ہے وہ صرف اللہ تعالی کو معلوم ہے، اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ روز قیامت اور عذاب قریب آچکا ہے

www.darleeman.com

یا میرا رب اس لیے کوئی دور کی مدت مقرر کرے گا اور اس پر یہ دلیل پیش کی کہ قیامت اور عذاب کے معین وقت سے میری بے خبری اس لیے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے اور وہ علم غیب کلی جس سے عالم کائنات کا کوئی ذرہ پوشیدہ نہ ہو (جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے) کسی کو ایسے غیب پر قبضہ اور قدرت نہیں، جس سے سارے کلیات جزئیات اور غیبی امور اس کے معلوم ہو جائیں البتہ جس کو اللہ تعالیٰ منصب رسالت ونبوت کے لیے پسند فرماتے ہیں تو اسے بقدر ضرورت امور غیبیہ کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور ان معلومات غیبی اور خبروں کو محفوظ ترین طریقے سے اپنے بندے کو پہنچا دینے کے لیے ان کے نزول کے وقت فرشتوں کا پہرہ اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں تا کہ وحی الٰہی ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہے اسی وجہ سے انبیا علیہم السلام کے علم میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں استثناء (الا من ارتضی) میں غیب کلی اور تمام امور غیبیہ مراد نہیں بلکہ وہ امور غیبیہ اور احکامات شرعیہ مراد ہیں جن کا تعلق منصب رسالت اور نبوت سے ہے جیسا کہ اس سے پہلے آیۂ کریمہ سے یہ واضح ہے اور اس طرح اس کے بعد والی آیت میں اس کی وضاحت موجود ہے چونکہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لیعلم ان قد ابلغوا رِسٰلٰتِ ربِھم واحاط بِما لدیھِم واحصی کل شئی عددا﴾ (الجن:۲۸)

"تا کہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں اور (حقیقت میں پہلے ہی سے) اللہ تعالیٰ ان تمام احوال کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اس نے ایک ایک چیز کو گن کر رکھا ہے۔"

یہاں ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ منصب نبوت ورسالت کا تعلق چونکہ شریعت اور احکام کی تبلیغ سے ہے اس لیے اس کے کچھ کلیات کا علم بقدر ضرورت انبیاء علیہم السلام کو دیا جاتا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر اس علم کی انتہا کی اور نبوت کو ان پر ختم کیا۔ چنانچہ انہی کلیات سے ہر زمانے میں ان کے وارثین علماء کرام پیش آنے والے واقعات کے احکامات نکال لیتے ہیں اور یہی سلسلہ تا قیامت جاری وساری

www.darulemaan.com

رہے گا جس کی وجہ سے نہ کسی نئے نبی کی ضرورت ہے اور نہ اس کے آنے کا امکان۔

پوشیدہ اشیاء کی چند ضروری اقسام کے بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تکوینیات کا علم ہو یا اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی مرضیات نامرضیات کا علم ہو، سب کے سب اللہ کے ساتھ خاص ہیں اور ان کا علم کلی تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا نہیں فرمایا البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے ضرورت کے مطابق جزوی طور پر اپنے بندوں کو علم عطا فرماتا ہے پھر وہ اپنے علم غیب میں سے احکام شریعہ تو صرف انبیاعلیہم السلام کو بذریعہ وحی بتلاتا ہے اور تکوینی امور غیبیہ میں سے (جیسا کہ چوتھی قسم میں بتلایا گیا) خاص خاص واقعات اور آئندہ آنے والے حالات کا علم جزئی بھی انبیاءعلیہم السلام کو بذریعہ وحی یا اولیاء کرام کو بذریعہ الہام جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے عطا فرماتا ہے جو منجانب اللہ تعالیٰ عطا کیا ہوا علم ہوتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یعلم ما بین ایدِیھِم وما خلفھم ولا یحیطون بِشئی مِن عِلمه اِلّا بما شآء﴾(البقرہ:۲۵۵)

یعنی ''جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس کے پیچھے ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے مخلوقات (میں سے کوئی بھی) اس کے علم میں سے کسی چیز پر بھی احاطہ نہیں کر سکتی مگر یہ کہ جس قدر علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے (صرف اتنا ہی علم ان کو ہو سکتا ہے)۔''

اسی طرح جب محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو کفار و مشرکین آپ ﷺ کی رسالت و نبوت پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ کیا رسول ایسا ہوتا ہے جو انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازوروں میں چلتا پھرتا ہے غرض وہ ہر اس چیز کو دیکھ کر اعتراض کرتے تھے جو لوازماتِ بشریت اور انسانی زندگی کے لیے ازبس ضروری ہیں، ان کفار، مشرکین کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوازمات بشریت سے مستغنی اور مافوق البشری قوتوں کا مالک ہو، کائنات کا ایک ایک ذرہ اس پر روشن ہو، ماضی

www.qurqeman.com

اور مستقبل کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہ ہو اس لیے وہ آپ ﷺ سے طرح طرح کی فرمائشیں بھی کرتے تھے چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ہم تب مانیں گے اگر آپ ان خشک پہاڑوں کو ہموار سرسبز زمین میں تبدیل کر دیں، اس میں ایسے چشمے ابلنے لگیں جس میں سے ندیاں اور نہریں جاری ہوں وغیرہ وغیرہ۔

نیز وہ لوگ آپ ﷺ سے قسم قسم کے غیبی امور بتلانے پر بھی اصرار کرتے تھے تو ان سارے بے ہودہ سوالات اور بے جا فرمائشوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿قل ما کنت بِدعاءِ من الرسلِ وما ادرِی مایفعل بی ولا بِکم اِن اتبِع اِلا ما یوحیٰ اِلیّ وما انا اِلّانذِیرٌ مبینٌ﴾ (الاحقاف:۹)

یعنی ''آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور میں (اپنے عقل وفہم سے) نہیں جان سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے ور میں صرف ایک صاف صاف ڈرانے (خبردار کرنے والا) ہوں۔''

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کفار ومشرکین سے کہہ دیں کہ میری رسالت ونبوت دنیا کی تاریخ میں پہلا واقعہ نہیں کہ تمہیں خدا کے رسول کو پہچاننے میں پریشانی ہو بلکہ مجھ سے قبل بہت سے انبیاء ورسل دنیا میں آچکے ہیں، جن میں بعض کو تو تم بھی مانتے ہو اور تم کو ان سے عقیدت بھی ہے، آخر وہ بھی تو انسان وبشر تھے، کھاتے پیتے تھے، آخر ان میں سے کون سا رسول ایسا گزرا ہے جس نے اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھایا ہو یا پھر اس نے از خود اپنے ذاتی علم سے سب کچھ جانا ہو۔ اگر ایسا نہیں اور نہ ہوسکتا ہے تو پھر میری رسالت ونبوت کو پرکھنے کے لیے ایسی نرالی اور انوکھی کسوٹی تم کہاں سے لائے ہو۔ پھر اس کے بعد: ﴿ما ادرِی ما یفعل بِی ولا بِکم﴾ سے رسالت اور نبوت کی حیثیت بتلائی کہ میں عقل وشعور اور قیاس سے نہ یہ جانتا ہوں کہ آخرت میں تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ میں یہ جان سکتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا اور مجھ پر ایمان لانے والوں کا اور میری اس دعوت کا انجام کیا

www.dawateislam.com

ہوگا اور تمہارے ان مظالم اور زیادتیوں کی تمہیں کب اور کیسی سزا ملے گی ،غرض دنیا و آخرت کے امورِغیبیہ سے متعلق وحی الٰہی کے بغیر[1] مجھے کوئی علم (جسے یقین کہا جاتا ہے) نہیں خواہ وہ میری ذات سے متعلق ہو یا دوسرے لوگوں مؤمنین اور کفار و مشرکین سے متعلق خواہ وہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا، تفصیلی ہو یا اجمالی اس کی مجھے کچھ خبر نہیں، اور یہ امورِ آخرت (برزخ، جنت و دوزخ، حساب و کتاب، مشرکین و کفار کے لیے سزا اور مؤمنین کے لیے جزا) سے متعلق یا دنیا میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جو کچھ بیان کرتا ہوں یہ میری عقل، فہم و ذہانت کا اثر نہیں بلکہ امورِ غیبیہ کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے جو میری طرف بھیجی جاتی ہے اور میں اس کی اتباع اور پیروی کرتا ہوں۔

بلا شک وشبہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بذریعہ وحی وہ بتلا دیا ہے جو پوری کائنات میں نہ کسی نبی ،مرسل کو عطا فرمایا ہے اور نہ کسی مقرب فرشتے کو، آپ پر سلسلہ رسالت و نبوت کو ختم فرمایا اور آپ پر رسالت و نبوت کے کمالات آپ کے اور شایانِ شان علوم کی انتہا کی حضرت علامہ آلوسی رحمہ اللہ علیہ اسی آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:والذی اختارہ ان المعنی علی نفی الدرایة من غیر جهةالوحی سواء کانت الدرایة تفصیلیة او اجمالیة و سواء کان ذالك فی الامور الدنیویة اوالاخرویةواعتقدانه ﷺ لم ینتقل من الدنیا حتی اوتی من العلم باالله تعالیٰ وصفاته و شؤنه والعلم با شیاء یعد العلم کمالا مالم یوته احد غیره من العالمین ولا اعتقدفوات کمال

[1] یعنی میں نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ میں خود بخود سب کچھ جانتا ہوں اور نہ دعویٰ کیا ہے، کہ خدائی اختیارات میرے ہاتھ میں ہیں، تو جب میں نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو آپ کے سوالات اور فرمائشیں بے جا اور بے وزن ہیں کیونکہ عالم الغیب اور تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اس کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے اس میں پیروی اور تعمیل کرتا ہوں۔

www.darulieman.com

بعدم العلم بحوادث دینویه جزئیة کعدم العلم بما یصنع زید مثلًا فی بیته وما یجری علیه فی یومه اوغده، ولااری حسناقول القائل انه علیه الصلوة والسلام یعلم الغیب ، واستحسن ان یقال بدله انه صلی الله علیه وسلم اطلعه الله تعالیٰ علی الغیب اوعلمه سبحانه ایاه او نحو ذالك ، وفی الآیة ردّ علی من ینسب لبعض الاولیاء علم کل شئی من الکلیات والجزئیات وقد سمعت خطیبا علی منبر المسجد الجامع المنسوب للشیخ عبد القادر الکیلانی قدس سره یوم الجمعة، قال باعلی صوت یا باز !انت اعلم بی من نفسی، و قال لی بعض انی لا عتقدان ان الشیخ قدس سره کل شیء منی حتی منابت شعری ، ومثل ذالك مما لا ینبغی ان ینسب الی رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم فکیف ینسب الی سواه ؟ فلیتق العبد مولاه .....(روح المعانی : ۲۶/۱۰۔ اداره الطباعة المنریة)

یعنی ”میرے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہاں ایسی روایت اور جان لینے کی نفی ہے جو بغیر کسی وحی کے خود بخود ہو، خواہ تفصیلی ہو یا اجمالی، خواہ دنیا کے واقعات سے متعلق ہو یا اس کا تعلق آخرت کے حالات سے ہو (اس کے بعد علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ) میرا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت تک دنیا سے انتقال نہیں فرمایا جب تک اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے شؤن کا علم نہ دے دیا گیا ہو اور ان اہم اشیاء (یعنی دنیا و آخرت میں آئندہ پیش آنے والے اہم واقعات) کا علم بھی جن کا علم کمال سمجھا جاتا ہے، جو پوری کائنات میں آپ ﷺ کے سوا کسی دوسرے کو عطا نہیں کیا گیا اور میرا یہ اعتقاد نہیں کہ جزوی واقعات اور حادثات جیسے مثلاً زید اپنے گھر میں کیا کام کرتا ہے اور اس پر آج اور کل کیسے گزرے گا، علم نہ ہونے کی وجہ سے کمال نبوت میں فرق آتا ہے (کیونکہ اسی طرح غیبیہ امور کا علم نہ کوئی کمال ہے اور نہ اس کے نہ ہونے سے کمال نبوت میں فرق آتا ہے) (وہ فرماتے ہیں کہ) میں کسی شخص کے اس قول کو اچھا نہیں سمجھتا کہ آپ ﷺ غیب جانتے تھے (اور تقاضائے ادب کی وجہ سے

بلاضرورت ایسا کہنا بھی مناسب نہیں کہ آپ ﷺ غیب نہیں جانتے تھے) بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غیب کی چیزوں پر مطلع کیا تھا یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو غیبی امور بتلائے تھے یا اسی طرح کسی دوسرے الفاظ میں کہیں جس میں نہ تو بے ادبی کی شان پائی جائے اور نہ آپ ﷺ کو خدائی اختیارات کا مالک ٹھہرا کر ان کے اس فرمان عالی کی مخالفت کی جائے کہ:

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم قولوا عبدالله و رسوله

(خبردار) مجھے حد سے نہ بڑھا جس طرح عیسائیوں نے (حضرت) عیسی علیہ السلام کو (بشریت سے خارج کر کے خدا کہہ کر) حد سے بڑھایا تھا (سن لو) مجھے تم اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا (پھر اس کے بعد علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ) اس آیت میں ان لوگوں کے نظریہ کی تردید کی گئی ہے جو بعض اولیاء کی طرف تمام کلیات و جزئیات کے علم کو منسوب کرتے ہیں میں نے جامع مسجد میں جسے شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی مسجد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جمعہ کے دن اسی مسجد کے منبر پر بیٹھے ہوئے تھے خطیب سے سنا، وہ بلند آواز سے پکار کر کہہ تھے اے باز آپ (شیخ عبدالقادر جیلانی) میری جان پر مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور بعض نے مجھ سے کہا کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ (شیخ عبدالقادر جیلانی) قدس سرہ میرے جسم کی ہر ہر چیز پر علم رکھتے ہیں حتی کہ میرے بال کی جڑوں سے بھی ان کو واقفیت ہے (تو علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ) اس طرح کا علم تو ایسا ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی منسوب نہیں کرنا چاہئے چہ جائیکہ آپ ﷺ کے سوا کسی دوسرے کی طرف تو (ایسے کہنے والے) بندے کو چاہیے کہ (اس طرح کہنے میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔"

حاصل یہ ہے کہ تمام غیبی امور کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی اور کو نہیں دیا ہے اور وہی عالم الغیب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض جاہل عوام جب یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو وہ ان کے ساتھ یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کو کسی غیب کی چیز کی خبر بھی نہیں ہوگی یہ تو نبوت اور

www.darulemaan.com

رسالت کی نفی وانکار ہے حالانکہ غیبی خبر اور غیب میں فرق واضح ہے اگر کوئی آپ کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ دے تو کیا اس سے آپ عالم الغیب بن گئے بلکہ یہ تو چھپی ہوئی خبر ہے جو آپ کو بتلائی گئی۔اسی طرح کسی بھی نبی مرسل کو اللہ تعالیٰ نے لاکھوں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب اور ذرائع سے عادۃً حاصل ہو جاتا ہے غیب نہیں۔اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ کشف والہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دے دیا گیا وہ علم غیب کی حدود سے نکل جاتا ہے اسی طرح جو شخص اسباب وذرائع ،آلات وتجربات ومشاہدات اور دلائل سے کوئی علم حاصل کرتا ہے،اس شخص کو عالم الغیب نہیں کہتے جیسے ریاضی کے قواعد سے کوئی حساب ومقدار معلوم کرلے یا طب،حکمت،نفسیات،منطق،فلسفہ،سائنسی ایجادات،ریڈیو،وائرلیس وغیرہ کے ذریعے کوئی چیز معلوم کرے تو وہ غیب کا جاننے والا نہیں،اسی طرح کشف والہام یا وحی کے ذریعے کسی کو بعض چیزوں کا علم ہو جائے تو اس علم کو قرآن مجید میں انبا الغیب (یعنی غیب کی خبریں) کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ﴾

'' یعنی یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔'' عالم الغیب تو وہی ہوتا ہے جس کا علم ہر واسطہ،وسیلہ،سبب،آلات اور دلیل وغیرہ سے بے نیاز ہو اور ایسا علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔کہ پوری کائنات میں ہر مادہ کے رحم میں جو حمل ہو ہر ایک کو بیک وقت [1] جانتا ہے

[1] اللہ تعالیٰ کا علم اور دیکھنا ایسا نہیں کہ ایک آن میں ایک یا چند کا معائنہ کرلے یا دیکھ لے اور دوسرے وقت میں دوسری اشیا پر نظر اور توجہ دے۔جس طرح انسانوں اور دوسری مخلوقات کا حال ہے بلکہ ازل سے ابد تک کی تمام چیزیں ساری کی ساری اس کے سامنے ایسی دائمی مستحضر ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی ذرہ یا کسی مخلوق کا خیال وغیرہ اس سے چھپ نہیں سکتا۔

کہ نیک ہوگا یا بد،خوبصورت ہوگا یا بدصورت،نیک بخت ہوگا یا بدبخت،عمر اس کی کتنی ہوگی۔غرض

مستقبل میں اس پر جو حالات وعوارضات وارد ہونے والے ہوتے ہیں وہ تفصیل کے ساتھ ان سب کو جانتا اور دیکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو ان تمام اشیا کے احوال اور حقائق کا جاننے والا ہے جو کائنات میں کبھی تھے یا اب ہیں یا مستقبل میں ہوں گے۔ غرض اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ازل سے ابد تک بلا واسطہ ہر چیز کا مکمل علم ہے، جملہ کائنات میں جتنے ذرات ہیں ان تمام کی کل تعداد اور وزن سے اس کو واقفیت ہے، ساری دنیا کے سمندروں، دریاں وغیرہ میں جتنے قطرے ہیں، ان کا شمار اس کے علم میں ہے، ہر بارش کے قطرے اور تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کی تعداد اور ان میں باریک لکیروں میں سے کوئی لکیر اس سے کسی وقت مخفی نہیں رہ سکتی۔ ہر درخت کا ہر پتا گرنے سے پہلے اور گرنے کے بعد اور ہر درخت پر لگا ہوا پتا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا، کب اور کہاں گرے گا اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ ہر چیز کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے عین حیات میں اور اس کے مرنے کے بعد اپنے علم تفصیل سے جانتا ہے۔ اس کا علم اور مشاہدہ کا ہر ان کائنات کے ایک ایک ذرے کو محیط ہے اور کوئی ذرہ اس سے کسی وقت بھی پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر شے کی صفات، خواص، کیفیات، وزن، مقدار اور شمار بلا واسطہ جانتا ہے۔ وہ ان چیزوں کے جاننے میں کسی واسطے اور وسیلے کا محتاج نہیں، اور اس کا یہ علم اپنا ذاتی ہے کسی نے اس کو سکھایا نہیں، نیز اللہ کا علم لامحدود اور بے بہا ہے۔ تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے وہ بہت محدود ہے، اگر چہ رسول اللہ ﷺ تمام انبیا علیہم الصلوا السلام سے زیادہ عالم تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ علوم عطا فرمائے جو کسی مقدس نبی، مقرب فرشتے بلکہ تمام مخلوقات میں سے کسی کو عطا نہیں کیے گئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اس کے حقوق اور قانون کا علم، ماضی، مستقبل کے لاکھوں واقعات کا علم برزخ اور قبر کے حالات، جنت، دوزخ اور اخرت کا علم غرض وہ تمام علوم جو آپ کی شایان شان تھے عطا کیے گئے لیکن پھر بھی حضور ﷺ، تمام انبیا علیہ السلام فرشتے، جن وانس اور تمام اولین اور آخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے علم محیط سے کوئی نسبت نہیں صحیح بخاری شریف کی روایت ہے کہ

www.darulegman.com

حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو دریا کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

ما علمی و علمك من علم اللہ إلّا مثل مانقص هذا العصفور من هذا البحر. (کتاب التفسیر بخاری باب الکهف: ۶۷۸/۲)

''اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرے اور آپ کے علم کی مثال اس قطرے کی ہے جو اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔''

یہ مثال محض سمجھانے کے لیے ہے ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم کے ساتھ کوئی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت علم پر اس کے دوسرے صفات کمالیہ کو بھی قیاس کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمالیہ اس کی ذاتی اور لامحدود ہیں مخلوق میں جو بھی کوئی خوبی وصفت نظر آتی ہے وہ محدود اور صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی صفات میں سے کسی صفت کا مظہر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجرا میں کسی کو خود مختار ماننا شرک ہے!

جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات میں سے کسی کو کسی درجہ میں شریک کرنا شرک ہے اس طرح یہ بھی شرک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجزاء اور نفاذ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو صاحب اختیار مانا جائے یعنی اگر چہ یہ مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے اور وہی قادر مطلق ومتصرفِ مطلق اور تمام صفاتِ کمالیہ میں یگانہ ہے۔ لیکن اگر مخلوق جیسے ملائکہ یا ارواح یا کسی انسان یا جن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نیان کو مستقل طور پر کچھ انتظامی امور سپرد کر دیئے ہیں جیسے بارش برسانا یا مافوق الفطرت طریقہ سے نفع وضرر پہنچانا دعائیں قبول کرنا وغیرہ۔ اور یہ ان چیزوں کے نفاذ میں اس طرح خود مختار ہیں جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنے ماتحت حکام اور افسران کو کچھ انتظامی اختیارات دے دیتے ہیں اور اس کے بعد وہ حکام ان اختیارات

www.darulemaan.com

کے اجراء اور استعمال میں خود مختار ہوتے ہیں اور پھر نہ بادشاہ سے پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اسے خبر ہوتی ہے اس لئے لوگ ماتحت حکام کو خوش کرنے کے لئے ان کو ہدایا دیتے ہیں اور ان کی چاپلوسی کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے اختیارات اس کے بارے میں نافذ کریں۔ اس طرح کسی بھی مخلوق کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اللہ کی صفت کے اجراء ونفاذ میں خود مختار ہیں تو یہ بھی شرک ہے [1] اور حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر جو خاص حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی حق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لیے مانا جائے مثلاً کسی مخلوق کی محبت اور تعظیم کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا، یا اس کی اطاعت میں کسی اور

---

[1] مسلمانوں کا یہ عقیدہ جو نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے انتظامات مثلاً بارش برسانا، مارنا وغیرہ ملائکہ کے سپرد کئے ہیں یہ شرک ہرگز نہیں، کیونکہ مسلمان اللہ رب العزت کے سوا کسی اور کے لئے کسی باب میں بھی، ذرہ برابر مستقل اختیار ثابت نہیں کرتے ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور حکم کے بغیر کوئی مخلوق کچھ نہیں کرسکتی حتیٰ کہ پتا بھی اگر کہیں گرتا ہے تو اس کے حکم سے ہی اور اس کے علم کے مطابق گرتا ہے اور یہاں ملائکہ وغیرہ کی حیثیت صرف غلامانہ ہے جیسے کوئی شخص اپنے مختلف غلاموں میں کام بانٹ دے کہ جب میں کسی کیلئے پانی دینے کا حکم کروں اس حکم کی تعمیل فلاں فلاں کو کرنا ہوگی اور جب کھانے کے بارے میں اِ وازدوں تو فلاں فلاں غلام اس کام کو سرانجام دے غرض حکم کی تعمیل کے لیے مختلف امور پر مختلف غلاموں کو لگا دیتے ہیں تاکہ افراتفری نہ ہو اور نظام باقاعدہ چلے تو یہ شخص آواز دیتا ہے کہ فلاں کو اتنی مقدار پانی پہنچا دیا جائے تو پانی والا خادم اٹھ کر فوراً تعمیل کرتا ہے۔ اس طرح جب اللہ تعالیٰ کسی ملک کے بارے میں جتنی مقدار بارش کا حکم فرماتے ہیں تو مقررہ فرشتہ حکم بجالاتا ہے۔ اگر حکم کردے کہ فلاں شخص کی موت فلاں وقت فلاں جگہ واقع ہو تو موت کا فرشتہ اس کا انتظام کرتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے ذرہ ذرہ اور جملہ امور میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہوتا ہے اس لیے مسلمان بارش برسانے، موت سے بچنے وغیرہ میں صرف اللہ تعالیٰ ہی سے درخواست کرتا ہے نہ کہ بارش برسانے پر مامور فرشتہ وغیرہ کو پکارتا ہے۔

www.maktabah.org

کو شریک کرنا جیسے کسی کے لئے ایسا مستقل اختیار ثابت کرنا کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکتا ہے۔(اس کی تفصیل ان شاءاللہ آئندہ صفحات میں آئے گی)اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک کرنا جیسے سجدہ، رکوع، نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ یا کسی مخلوق کو عالم اسباب کی چیزوں سے بالاتر اور اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ سمجھ کر اس سے مشکلات اور مصائب میں مدد مانگنا (یہ سب شرک کی مختلف صورتیں ہیں)۔

شرک جلی اور ایک شبہ کا ازالہ!

مذکورہ بالا بحث سے یہ الجھن دور ہو جاتی ہے کہ ہم دنیا میں بہت سی چیزوں سے فائدے اٹھاتے ہیں مثلاً پانی سے پیاس بجھاتے ہیں اور روٹی سے بھوک دفع ہوتے دیکھتے ہیں۔آگ سے گرمی اور دواؤں سے صحت کا حاصل ہونا نظر آتا ہے۔علاج کے لئے حکماء اور ڈاکٹروں سے کام کاج میں نوکروں یا کاریگروں سے مدد لیتے ہیں۔اسی طرح غریب محتاج لوگ امراء اور حکام سے مدد طلب کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔یہ سب کچھ شرک کیوں نہیں؟ اس لیے کہ عالم اسباب کی ان اشیاء میں اللہ تعالیٰ نے خاصیتیں اور تاثیریں رکھ دی ہیں۔ پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر، آگ میں گرمی اور روشنی کی خاصیت اور دواوں میں امراض دور کرنے کی قوت۔ان خواص اور تاثیروں میں خود ان اشیا کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ان چیزوں کی حیثیت ہمارے نوکروں کی سی ہے اور ان سے کام لینا ایسا ہی ہے۔جیسے ہم اپنے جانوروں یا اوزار و مصنوعات سے کام لیتے ہیں۔ان سے کام لینے میں شرک کی کوئی وجہ نہیں۔پھر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی قابلیت دے رکھی ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے انسانوں کو کوئی فائدہ یا امداد پہنچا سکتے ہیں مثلاً حکیم، ڈاکٹر امیر، حاکم یا کاریگر وغیرہ۔ان کے بارے میں ہر سلیم العقل آدمی جانتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں ہوتی، اور ان کے قبضہ میں کچھ نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ بھی ہماری ہی طرح اللہ تعالیٰ کے محتاج بندے ہیں بس بات اتنی سی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب میں انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے کسی ضروری کام میں مدد لے سکتے ہیں پس ان سے مدد حاصل کرنے یا کام لینے میں شرک کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔شرک تو

www.tarjeeman.com

تب ہوتا ہے جب کسی کو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ظاہری اسباب کے سلسلہ سے بالاتر یعنی غیبی طور پر اپنے ارادہ اور اختیار سے کارفرما اور متصرف سمجھا جائے، پھر اسی عقیدہ کی بنا پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے اور اسے راضی کرنے کے لئے اس کی عبادت کی جائے اور ایسے شرک عظیم کو شرکِ جلی کہتے ہیں۔

معجزات وکرامات صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں!

بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ایسے کام عالم وجود میں آئے جو عام انسانوں کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں جنہیں معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ سے بھی بعض اوقات ایسے بہت سے کام صادر ہوتے ہیں جو خلاف عادت ہوتے ہیں، ان کو کرامات کہتے ہیں۔ جنہیں سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت واختیار انہیں سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھوں سے کیسے یہ کام وجود میں آتے، جس سے وہ ان انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام کے لیے ایک درجے میں مختار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں اس لیے مناسب یہ ہے کہ معجزات وکرامات کی حقیقت بیان کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کرامات ومعجزات بھی صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت واختیار سے وجود میں آتے ہیں۔

معجزہ کی حقیقت!

معجزہ لغت میں عاجز کر دینے والی چیز کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں معجزہ ایسے عمل کو کہتے ہیں جو کسی پیغمبر سے بغیر کسی سبب طبعی کے عالم وجود میں آئے اور اگر ایسا کوئی کام ولی اللہ کے ذریعے وجود میں آئے تو اسے کرامت [1]

---

[1] یعنی عملی اور مشاہد تو ایسے ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور یہ کلام عملی معجزہ ایسا ہے جو قیامت تک ہر وقت میں ہر شخص پر حجت تام ہے مثلاً عصا اور ید بیضا حضرت موسیٰ علیہم السلام کی رسالت ونبوت کی دلیل تھے لیکن ان کے تشریف لے جانے کے بعد وہ موجود نہیں۔ لیکن قرآن مجید ہر وقت پکار کر اعلان فرماتا ہے کہ مجھ جیسا کلام پیش کرو ورنہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے کتاب دہریت سے اسلام تک باب حقانیت اسلام کو ملاحظہ کیجیے۔

www.dawateislam.com

کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو معجزے دے کر لوگوں کو اپنے احکامات کی طرف بلانے پر مامور فرماتے ہیں اور ان معجزات سے مقصود ان کی رسالت و نبوت کی تصدیق کرنا ہوتا ہے ہ جو کام عام آدمی نہ کر سکے وہ انبیا علیہم السلام سے ظاہر ہوتا ہے تا کہ عوام سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کا تعالیٰ کا پیغمبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننا اور اس کے بتلائے ہوئے عقیدے کے مطابق اور اس کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل ہے اور جو منکر حق اسے نہ مانتے ہوں ان پر حجت تام ہو اور وہ مستحقین عتاب بن جائیں۔ پچھلے انبیاء علیہم السلام کو عموماوہ معجزے دئے گئے جو عملی اور مشاہد (نظر آنے والے) تھے جیسے حضرت ابراھیم علیہ السلام پر دہکتی ہوئی آگ کا ٹھنڈی اور سلامتی والی (غیر مضر) ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا وغیرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادر زاد نابینا اور کوڑھوں کو تندرست کر دینا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ چونکہ آپ ﷺ کی نبوت تمام انسانوں کے لیے ہے، اس لیے حضور ﷺ کو جہاں ایک طرف ہزاروں عملی اور مشاہد معجزات دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے عہد مبارکہ میں مسلمانوں کا ایمان وایقان پختہ اور غیر متزلزل ہوا اور قدسیوں کی ایک ایسی عظیم جماعت تیار ہوئی جن کے ایمان میں شک کرنا بلکہ ان پر تنقید کرنا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے تو دوسری طرف رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے ایک ایسا کلام علمی معجزہ (قرآن مجید) عطا فرمایا جو لاکھوں عملی اور مشاہد معجزوں سے بڑھ کر ہے جو بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال سورج کے روشن ہونے پر دلائل قائم کرنا ہے ور یہ ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے اور قیامت تک کے انسانوں کے لیے پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے کی بجائے صرف قرآن مجید کی چھوٹی سی سورت کی مثال پیش کرنے کا چیلنج ہے اور تمام انس و جن اکٹھے ہو کر بھی اس کی مثال لانے سے قاصر و عاجز ہیں۔

معجزہ کا حکم!

ہر خاص و عام کے لیے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ انبیا و رسل علیہم السلام سے جو معجزات یقینی طور

پر ثابت ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا ٹھنڈا اور غیر مضر ہونا، حضرت موسیٰ کا عصا اور ید بیضا وغیرہ کے معجزے[1] جن کا ثبوت اور دلالت دونوں قطعی اور یقینی ہیں وہ حق ہیں اور ایسے معجزات پر ایمان لانا، ان کے وجود اور ان کی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کا انکار حقیقت میں اسلام اور قرآن سے انکار ہے۔

یقینی معجزوں کو دائرہ اسباب سے جوڑنے کی مذمت!

بعض نام نہاد مسلمان جن کے دماغ پر مغربی دنیا کی مادہ پرستی اور مادی ترقی اور سائنسی برتری کا بت مسلط ہو چکا ہے، وہ قرآن مجید میں مذکور ایسے واقعات جن کا ظہور دنیا میں یقیناً بغیر کسی طبعی سبب کے ہوا ہے یعنی ایسے یقینی معجزات کو کسی نہ کسی طرح ایسے واقعات بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا وقوع اسباب طبعیہ کے تحت ممکن ہو۔ یہ حضرات ایسے واقعات کو مادی واقعات بنانے میں کسی بھی تحریف، تبدیلی سے نہیں چوکتے۔ خواہ ان کو صحیح احادیث کا رد کرنا پڑے یا قرآن کے سیاق وسباق کو چھوڑنا پڑے، خواہ قرآن مجید کی دوسری محکم آیات کریمہ کو نظر انداز کرنا پڑے کیونکہ ان حضرات کا رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کی بجائے قرآن وسنت کو اپنے نظریات کے تابع بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہ سب یا تو اس لیے کرتے ہیں ان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں کوئی

---

[1] ثبوت کا یقینی ہونا یہ ہے کہ اس امر کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہو یا اس کا علم ہمیں متواتر حدیث شریف سے حاصل ہو چکا اور اس کی دلالت کا یقینی ہونا یہ ہے کہ اس کے معنی میں بھی کوئی ابہام نہ ہو اور نہ اس میں کسی معنی کا احتمال ہو پس جو لوگ فی الجملہ معجزات کو مانتے ہیں مگر کسی ایسے واقعہ کا ظہور جس سے ان کا معجزہ ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں بلکہ اس میں معجزہ اور غیر معجزہ دونوں کا قوی احتمال موجود ہے اس کو وہ دائرہ اسباب سے جوڑ دے تو ایسے شخص کو خواہ مخواہ منکر معجزات وکرامات کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

www.darulehsan.com

روشن خیال انہیں قدامت پسندی کا طعنہ نہ دیدے یا ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مغربی نظریات سے قرآن وسنت کو ہم آہنگ کیا جائے تا کہ ان سے داد اور دنیاوی مفادات حاصل کریں یا اگر ہم ان سے حسن ظن رکھ کر ان کے بارے میں یہ گمان رکھیں کہ ان کی اس طرز عمل سے مراد یہ ہے کہ اس سے نام نہاد عقلیت پسند اور مستشرقین کے بے ہودہ اعتراضات کا جواب ہو جائے گا تو پھر یہ یقیناً قرآن اور اسلام کے ایسے نادان دوست اور ہمدرد ہیں کہ ان کی دوستی اور ہمدردی دشمنان اسلام کے تعصب وعداوت سے لاکھوں گنا بڑھ کر خطرناک ہے کیونکہ غیر مسلم کی کھلی مخالفت اور فریب دہی سے عوام کا بچنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس ایک شخص سے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی عقائد اور اعمال کو مسخ کر دیتا ہے۔

معجزہ سے انکار کی وجہ!

جو لوگ معجزات کے سرے سے قائل نہیں ہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے منکر ہیں اور بعض لوگ اگر چہ خدا کو مانتے ہیں لیکن ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا فرما کر اس نظم کو ایک قانون پر چلا دیا۔ اس کے بعد کائنات کے نظم وتدبیر میں اس کا کوئی دخل نہیں رہا۔ اور الگ تھلگ بیٹھ کر ایک بے بس تماشائی کی طرح کائنات کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے ایسے لوگ جب خرق عادات واقعہ جو دائرہ اسباب سے ماورا ہو، کے متعلق سنتے ہیں تو اس کو ایک افسانہ باور کر کے رد کر دیتے ہیں اور اگر کہیں وہ ایسے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں تو اسے دائرہ اسباب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے تعطل کے قائل ہو کر برائے نام ایسے بے اختیار اور بے قدرت خدا کو مانتے ہیں جو کمزور ترین انسان سے بھی زیادہ لاچار و بے اختیار ہو، جو در حقیقت خدا کے نہ ماننے کے مترادف ہے۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی تخلیق کی، وہی قادر مطلق

www.darulemam.com

ہے، تمام اختیارات کا مالک صرف وہی ذات ہے وہ کائنات کی تدبیر و انتظام خود کرتا ہے، پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مشیت کے تحت ہوتا ہے حتیٰ کہ کسی درخت کا پتہ بھی اس کے اذن کے بغیر جنبش تک نہیں کرسکتا اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے تمام اشیا کو پیدا فرمایا اور ان میں یہ خاصیتیں رکھ دیں۔ تو جس طرح یہ اشیاء خود اپنے وجود اور بقا میں اللہ تعالیٰ کی محتاج [1] ہیں اسی طرح ان کے خواص بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور نفع اور ضرر پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اگر چہ ان خاصیتوں کے لیے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے عام قانون اور معمول یہی رکھا ہے کہ وہ اپنی خاصیتوں پر قائم رہیں مثلاً آگ میں جلا دینے کی خاصیت ہے۔ اور اس کا عام معمول یہ ہے کہ جو بھی آتش پذیر چیز اس میں پڑ جائے تو وہ جل جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہے اس کی خاصیت کو خاص حالت میں سلب کرلے اور اس کے عام معمول کو بدل دے جیسا کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈال دیا گیا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آگ کو حکم فرمایا کہ:

﴿ یانار کونی بردا وّ سلاما علی اِبراھیم ﴾ (سورت انبیا:۶۹)

''اے آگ! ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا ابراہیم پر۔''

تو وہ ٹھنڈی اور غیر مضر بن گئی کیونکہ تمام اشیا کی خاصیتیں اور معمول اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں وہ جس چیز کی خاصیت اور معمول کو بدلنا چاہے بدل سکتا ہے جیسا کہ یہاں آگ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی جلانے کی خاصیت چھوڑ دی اور گلزار بن گئی۔ اس طرح وہ وہ جب چاہے اشیا کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزوی یا کلی طور پر جیسا چاہے تغیر کرسکتا ہے کیونکہ وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔

معجزہ اور کرامت کی حیثیت!

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ معجزہ اور کرامت بغیر کسی طبعی سبب کے اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلاف

[1] مزید تفصیل کتاب دہریت سے اسلام تک میں ملاحظہ فرمائیں۔

www.car-ul-eman.com

عادت وجود میں آتے ہیں اس لیے کہ معجزات اور کرامات براہ راست حق تعالیٰ شانہ کا فعل مانا جاتا ہے صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی صداقت اور عظمت ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اقسموا بِالله جهد ایمانِهم لئِن جآ تهم اية ليؤ منن بِها ط قل اِنما الآيات عِندالله ومايشعِر كم انهآ اِذاجاء ت لايؤمنون﴾ (الانعام:۱۰۹)

یعنی ''اور وہ منکرین حق تعالیٰ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں اگر ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) آ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور (اے مسلمانو!) تمہیں ان منکرین حق کا حال معلوم نہیں کہ اگر ان کے سامنے نشانیاں (معجزے) آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔''

اور ایک جگہ سابقین انبیا علیہم السلام کے ساتھ پیش آنے والے حالات بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿ وما كان لِرسول ان يا تِى بِا ية اِلا بِاذنِ الله ج فاِذا جاء امر اللهِ قضِى بِالحقِ و خسِر هنا لك المبطِلون﴾ (المؤمن:۷۸)

یعنی ''اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی (معجزہ) لا سکے پھر جب اللہ تعالیٰ کا حکم (نزول عذاب) آ چکا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت (اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے) جھٹلانے والے خسارے میں پڑ گئے۔''

غزوہ بدر کے موقعہ پر آپ ﷺ نے کفار و مشرکین کے لشکر کی طرف ایک مٹھی بھر خاک اور کنکریاں پھینک دیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہر لشکری کی آنکھ میں جا لگیں۔ اس واقعہ کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

www.darulehsan.com

﴿وما رمیت اِذ رمیت ولٰکن اللہ رمیٰ﴾ (الانفال:۱۷)
یعنی" خاک یا کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے بھر کے پھینکی حقیقت میں (آپ نے نہیں پھینکی بلکہ) اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے۔"

جس کا مطلب یہ ہے یہ مٹھی بھر خاک اور کنکری اگر چہ آپ کے ہاتھ سے پھینکی گئی۔لیکن اس مٹھی بھر کا اثر کفار و مشرکین کے تمام لشکر کی آنکھوں میں پہنچا دینا اس میں آپ کے عمل کا کوئی دخل نہیں یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل تھا کہ اس نے اپنی قدرت سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کر کے یک لخت مٹھی بھر خاک اور کنکریوں کو دشمن کے سارے مجمع تک پہنچا دیا اور ان میں سے ہر ایک کی آنکھ میں اس کا اثر پہنچا دیا۔

اسی طرح بہت سی آیات کریمہ اس پر شاہد ہیں کہ کوئی پیغمبرِ خدا یا کوئی ولی اللہ جب چاہے جو چاہے معجزہ یا کرامت دکھا دے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیا علیہم السلام سے کفار و مشرکین نے بہت سے متعین معجزات کی فرمائش کی مگر جس معجزہ کو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے چاہا اس کو ظاہر کر دیا اور جس کا ظہور نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔

غرض معجزات و کرامات اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں۔ان کے ظہور میں نہ کسی ولی اللہ کو اختیار ہوتا ہے اور نہ کوئی نبی و رسول اس کے پیش کرنے میں خود مختار ہوتا ہے۔

البتہ انبیا علیہم السلام کی عظمت و احترام ہم پر لازم ہے کیونکہ معجزات و کرامات کا صدور انبیاء و اولیاء سے ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ ان کی صداقت وعظمت ثابت کرنے کے لیے اور ان کی تائید کے لیے ہوتے ہیں۔انہی کے واسطہ سے ان کا ظہور ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے ہم تک اللہ تعالیٰ کی رضا کے اعمال اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچتے ہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق!

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ انبیا علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات سے ایسے

www.darulemaan.com

واقعات ومشاہدے آتے ہیں، جو عام عادت کے خلاف ہوا کرتے ہیں، بظاہر سحر و جادو سے بھی ایسے ہی آثار واعمال ظاہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض کم فہم لوگ دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے جادوگروں کی پیغمبروں جیسی تعظیم کرتے ہیں۔ حالانکہ سحر و جادو اور معجزات و کرامات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سحر و جادو، مسمریزم، ہپناٹزم، ٹونے ٹوٹکے [1] وغیرہ سے جو چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ سب اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کیا سباب مخفی ہوتے ہیں۔ جو عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے۔ اس لیے عام لوگ یہی سمجھتے ہیں یہ کام بغیر کسی طبعی سبب کے ہوگیا۔ حالانکہ ان اشیا سے ظاہر ہونے والے مشاہدوں کے اسباب اہل فن پر مخفی نہیں ہوتے۔

دائرہ اسباب کی اقسام!

اس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ اسباب طبعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری اسباب اور مخفی اسباب۔ ظاہری اسباب سے جو چیزیں ظہور میں آتی ہیں چونکہ ان کے اسباب ہر کسی پر عیاں ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ چیزیں کسی کے لیے قابل حیرت نہیں ہوا کرتیں۔

مثلاً گندم کی کاشت سے گندم کا پودا نکل آنا، اور اپنے وقت پر پکنا۔ کسی تیز رفتار سواری پر سوار ہوکر کسی جگہ جلد پہنچنا یا جہاز میں اڑنا۔ جو بھی شخص گندم کی کاشت کرتا ہے وہ گندم حاصل کرسکتا ہے لیکن اسباب مخفیہ سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں اس کے اسباب خاص لوگوں کے علاوہ دوسرے عام لوگوں پر مخفی ہوتے ہیں مثلاً سائنسی ایجادات وغیرہ۔ ریڈیو پر آپ تقریر اور خبریں کیسے سنتے ہیں۔ یا مثلاً وائیرلس پر بغیر کسی تار وغیرہ کے ہزاروں میل دور کی باتوں کو کیسے سنتے ہیں یا مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم سے کسی کے خیال میں کوئی چیز ڈالنا یا اس کے خیال سے کسی چیز کا اچک لینا تو اس کے اسباب اہل فن پر مخفی

---

[1] کسی انسانی بال یا ناخن وغیرہ یا اس کے استعمال شدہ کپڑے وغیرہ کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں ملا دیتے ہیں اس کو ٹونہ ٹوٹکہ کہتے ہیں۔

www.darulfikr.com

نہیں ہوتے اور اس سے دفاع کرنے کی تدابیر اور طریقے بھی وہ خوب جانتے ہیں اسی طرح اگر شیاطین یا جن کے ذریعے کسی کے پاس دور کسی چیز کی خبر پہنچ جائے تو اس شخص کے لیے تو قابل تعجب بات ہوا کرتی ہے، جس کو اس کے اسباب معلوم نہ ہوں، لیکن اس آدمی کے لیے یہ قابل تعجب بات نہیں جو شیاطین و جن کی حیثیت اور ان کی تیز رفتاری اور ان سے کام لینے کی چالیں سیکھ چکا ہو، یا کم از کم وہ اس سے باخبر ہو۔

اسی طرح اگر کوئی دوائی لگا کر اپنے کو فائر پروف کر کے آگ کے اندر چلا جائے یا اپنے ہاتھ وغیرہ کو آگ میں داخل کر کے پھر صحیح و سالم نکل آئے۔ یہ کام تو کسی عام شخص کو متاثر کر سکتا ہے لیکن خواص کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آگ سے جلنے کی خاصیت نہیں ختم ہو جاتی اور نہ اس آدمی کا نہ جلنا کوئی معجزہ یا کرامت ہے۔ بلکہ دواں کے اثر سے وہ اپنے بدن کو آگ کی تپش سے محفوظ کر لیتا ہے اور جو بھی وہ دوائی استعمال کرے گا ایسی چال دکھلا سکتا ہے بخلاف معجزہ اور کرامت کے کہ وہ بغیر کسی طبعی اسباب کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بغیر کسی سبب کے حضرت ابراہیم علیہم السلام کے لیے نمرود کی آگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ٹھنڈی اور غیر مضر بنا دی اور آگ کو براہ راست حکم فرمایا:

﴿ کونی بردا و سلاما ﴾

تو وہ جلنے کے باوجود گلستان میں بدل گئی۔ غرض جادو ہپناٹزم، مسمریزم، ٹونے ٹوٹکے وغیرہ سے وجود میں آنے والی چیزیں دائرہ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں۔

بلکہ سائنسی مصنوعات کی طرح اہل فن کو ان کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے شیاطین و جن کو خوش کر کے ان سے کام لینا ہوتا ہے۔ یا قوت نفسیہ یا حروف [1] و کلمات لکھ کر یا ان کا ورد کر کے اس کا ظہور

[1] حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں کسی خاص حرف یا کلمہ کو خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے سے خاص تاثیرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

www.careeman.com

ہوتا ہے۔ جو دوسرے لوگ بھی فن سیکھ کر دکھلا سکتے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں اصول وقوانین پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے وہ ہر وقت ایسی شعبدہ بازیاں دکھلا سکتے ہیں بخلاف نبی و پیغمبر کے کہ ان کا معجزہ کسی اصول و قوانین اور اسباب کی بنیاد پر ظہور پذیر نہیں ہوتا اور نہ یہ ان کا پیشہ ہوتا ہے بلکہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی خاص قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عوام الناس معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ میں فرق کیسے کریں گے!

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ کے فرق کو خواص تو سمجھ سکتے ہیں لیکن عوام جو ان مخفی اسباب سے بے خبر ہیں وہ نبی اللہ، ولی اللہ اور جادوگروں میں فرق کیسے کریں گے، کیونکہ معجزہ و سحر وغیرہ دونوں کی ظاہری صورت تو تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حقیقت کے اعتبار سے معجزہ اور جادو میں آسمان و زمین کا فرق ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور جادوگروں میں ایسے واضح امتیازات رکھ دیئے ہیں جن کی وجہ سے لوگ ان کے دھوکہ میں آنے سے بچ جاتے ہیں اول یہ کہ معجزہ اور کرامت کا صدور ایسے حضرات سے ہوتا ہے جن کا تقوی، صداقت، امانت، طہارت و پاکیزگی، اخلاق و اعمال ایسے بلند ہوتے ہیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی تو عام زندگیاں اسی طرح آزمائش و امتحانوں کی کسوٹی پر پرکھی گئی تھیں کہ ان کا کوئی شعبہ زندگی ناقص اور قابل اعتراض نہ تھا اور ان کی تمام زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقت و کردار کا کمال لوگوں کے ہاں ایسا مسلم تھا کہ اگر کوئی معجزہ نہ بھی دکھلاتے تب بھی ان کی پیغمبرانہ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت گزر رہی تھی اور ان کی تعلیمات عقلی دلائل کی روشنی میں اسی قدر[1] صداقت پر مبنی تھیں کہ وہ راہ حق

---

[1] البتہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں انبیاء علیہم السلام کی نصرت کے لیے معجزات بھی دے دیتے ہیں کیونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سورج سے زیادہ عقلی و نقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق و صداقت کے قبول کرنے کے لیے دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

www.darulemaan.com

سے بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لیے ایک نسخہ کیمیا اور دینی و دنیاوی فلاح کا سبب تھیں۔لیکن اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور میں آتا ہے جو عام لوگوں سے زیادہ گندے، ناپاک، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل اور اس کی عبادت سے دور رہتے ہیں۔اور جو جادو گر گندگی اور ناپاکی میں جتنا زیادہ بلند ہو اس کا جادو اتنا ہی زیادہ موثر ہوتا ہے۔تو آخر دوسرے لوگوں کے لیے کیسے زندگی گزارنے کا نمونہ پیش کرسکتا ہے۔جس کی اپنی زندگی دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں سے زیادہ پست اور گندی ہو۔دوسرا فرق یہ ہے معجزہ کا توڑ لانا کسی بشر کی قدرت سے خارج ہوتا ہے بخلاف سائنسی مصنوعات اور جادو وغیرہ کے کہ اور لوگ بھی اسی طرح فن کو سیکھ کر اسے حاصل کر سکتے ہیں اور اس کا توڑ پیش کر سکتے ہیں۔ کوئی ایٹم بم کو بناتا ہے تو دوسرا یہ فن سیکھ کر وہ اسی طرح یا اس سے اعلیٰ بم تیار کر لیتا ہے۔اسی طرح ایک آدمی نے ریڈیو ایجاد کیا تو ہزاروں لوگوں نے مہارت حاصل کر کے اس سے اعلیٰ ریڈیو تیار کر لیا۔یہی حال جادو، ہپناٹزم، مسمریزم وغیرہ کا بھی ہے کہ کوئی یہ فن سیکھ کر یا اعمال نفسانی کی مشق اور اسکے طریقے سیکھ کر دوسروں کی طرح یا اس سے اعلیٰ کام شعبدہ بازیاں دکھلا سکتا ہے۔[1] کیونکہ ان تمام اشیا کا ظہور اسباب طبعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور ان کے اسباب سے اہل فن کو واقفیت ہوتی ہے اور ہر ایک ماہر فن

(بقیہ حاشیہ صفحہ:۳۹) دماغ کو مرعوب کر کے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ نبی کا یہ عمل بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور ان کو یہ یقین ہو جائے کہ اس بندہ خدا کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے اس لیے یہ جو کچھ بھی کہتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کہتا ہے۔

[1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ (العیاذ باللہ) سائنس اور سحر وغیرہ جیسی چیزیں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت سے بے نیاز ہو کر از خود موثر ہیں۔یہ عقیدہ تو خالص کفر ہے کیونکہ تمام اشیا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت کام کر رہی ہیں اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کوئی چیز نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان بلکہ یہاں تو یہ مقصود ہے کہ سائنس اور جادو وغیرہ سے جو مشاہدات ظہور میں آتے ہیں ان کا صدور بھی اسباب طبعیہ کے وجہ سے ہوتا ہے۔لیکن فرق صرف یہ ہے نظروں سے پوشیدہ اور اہل فن پر ظاہر ہوتے ہیں۔

www.darulemaan.com

اپنے سے زیادہ با کمال کو پہچانتا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون نے جب اپنے ملک کے تمام اعلی ساحروں کو جمع کر دیا تو انہوں نے اپنی لاٹھیاں و رسیاں میدان میں پھینک دیں وہ بڑے بڑے سانپ نظر آنے لگے لیکن جب حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا پھینک دیا تو وہ اژدہابن کر ان کے سارے سانپوں کو نگل گیا اور ان کے سحر کو توڑ دیا۔یہ واقعہ دیکھ کر جادوگروں کو ماہرین فن ہونے کی وجہ سے فوراً یقین آ گیا کہ بلاشبہ یہ ان کے فن اور اسباب طبعیہ کے تحت ظہور پذیر ہونے والی چیز نہیں بلکہ یہ خالص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ ہے تو وہ بیساختہ سجدے میں گر گئے اور بجائے اس طرح کہنے کے کہ ہم نے مان لیا کہ موسیٰ ہم سب سے زیادہ اعلی اور با کمال جادوگر ہے یوں پکار اٹھے کہ ہم اس رب کو مان گئے جس نے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ و ہارون علیہما وعلی نبینا الصلوۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے۔معجزہ اور جادو میں ہمارے علماء نے ایک فرق یہ بھی بتلایا ہے کہ نبوت کے دعوے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا نہیں، لیکن اگر یہ آخری وجہ نہ بھی ہوتی پھر بھی مذکورہ بالا دو وجوہ ایسی ہیں کہ جو ایک انسان کے لیے نبی و جادوگر میں فرق کرنے کیلئے کافی وشافی ہیں۔لیکن یہ بات ایک مسلمہ امر ہے کہ اب تک کسی جادوگر نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔اگر کبھی کسی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر بھی دیا تو پھر اس کا جادو اور اس کی پیشنگوئی اس کے منہ پر ماردی گئی۔

اصل حقیقت!

حقیقت اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے وہ سب قادر مطلق حق تعالیٰ سبحانہ کی طرف سے ہے۔تمام چیزیں اور سارے منافع اور نقصانات جن کا ظہور ان اشیا سے دکھائی دیتا ہے اللہ کی طرف سے ہیں اسی حقیقت کو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ساری دنیا کے لوگ، جن اور انسان مل کر تمہیں کوئی ایسا نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر نہیں فرمایا تو ان کی مجال نہیں کہ پہنچا سکیں اسی طرح اگر ساری دنیا کے جنات اور انسان مل کر تمہیں کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ

www.darulfikr.com

نے تمہارے لیے نہیں چاہا تو ہرگز نہیں پہنچا سکیں گے۔

مشرکین کے عقائد!

مشرکین عرب میں سے اکثر یہ مانتے تھے کہ زمین وآسمان اور ساری کائنات کا خالق ایک ہی ہے ایسا نہیں کہ کچھ چیزیں تو ایک نے پیدا کی ہوں اور کچھ کسی اور نے۔قرآن مجید میں جا بجا اس کی شہادت موجود ہے:

﴿ و لئِن سالتهم من خلق السموتِ والارض وسخرالشمس والقمر ليقولنّ اللهُ﴾ (سورۂ عنکبوت:۶۱)

''اور اگر آپ (ان مشرک) لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے بنایا اور سورج اور چاند کو کس نے کام پر لگایا ہے تو اقرار کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے (یہ سب کچھ کیا ہے)۔''

اس کے علاوہ وہ لوگ اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ کائنات کا سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ ہی چلاتا ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی مارتا ہے اور زندگی بھی دیتا ہے۔جیسا کہ سور یونس میں ارشاد ہے:

﴿قل من يرزقكم مِن السموتِ والارضِ أمن يملِك السمع والابصا ر ومن يخرِج الحى مِن الميتِ ويخرِج الميت مِن الحيِ ومن يدبِّرالامر ط فسيقولون اللهُ فقل أفلا تتقون﴾ (یونس:۳۱)

''اے پیغمبر! آپ (ان مشرکین سے) پوچھئے (کہ بتاؤ) روزی کون دیتا ہے، زمین وآسمان سے، یا کون کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور مردے کو زندہ سے اور کون ہے جو اس تمام کارخانہ کائنات کی تدبیر (انتظام) کرتا ہے (تو آپ جب ان سے پوچھیں گے) تو وہ (صاف) بول اٹھیں گے (یہ سب کچھ کرنے والا) اللہ تعالیٰ ہے سو آپ (ان سے) کہئے پھر ڈرتے نہیں ہو؟''

www.darulfurqan.com

بلکہ مشرکین عرب کے متعلق قرآن شاہد ہے کہ جب وہ بحری سفر کرتے اور دریا میں طوفان کی صورت پیدا ہو جاتی تو وہ اپنے سب دیوتاں کو بھول جاتے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے اسی سے اپنی امیدیں لگا دیتے۔

﴿و اِذا مسکم الضّر فِی البحرِ ضل من تد عون إلّا ایّا ہ﴾ (سورۃ الاسراء:٦٦)

یعنی ''جب تم پر دریا میں آفت آتی ہے، جن کو تم پکارتے تھے (سب) بھول جاتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔''

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿و اِ ذ غشِیھم موج کا لظللِ د عوا اللہَ مخلِصین لہ الدِّین﴾ (سورۂ لقمان:٦٤)

یعنی ''جب ان (مشرکین) کے سر پر (سمندر کے) موج یا بادل جیسے آئیں (تو پھر) اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہیں۔''

بہر حال مشرکین عرب اگر چہ غیر اللہ کی پرستش کرتے تھے مگر یہ بالکل واضح اور یقینی ہے کہ وہ اپنے جھوٹے معبودوں کو خدا یا مثل خدا نہیں سمجھتے تھے، اور اپنے معبودوں کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے تھے۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے میرے والد سے پوچھا اے حصین! تم کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو؟ میرے والد نے جواب دیا سات کی ''سِتا فِی الارضِ وواحِد ا فی السماءِ''۔ چھ زمین پر ہیں اور ایک آسمان میں۔

((قال فا یھم تعد لِ رغبتِك و رھبتِك؟ قال الذی فِی السماء)) (رواہ الترمذی)

''حضور ﷺ نے دریافت کیا کہ اپنی رغبت اور خوف کے لیے تم نے کس کو چن رکھا ہے، تو انہوں نے جواب دیا آسمان والے کو۔''

حدیث شریف کی کتابوں میں مشرکین کا وہ تلبیہ نقل کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں حج و عمرہ کے دوران پڑھا جاتا تھا۔

www.darulemaan.com

لبيك اللهم لبيك۔ لبيك لا شرِيك لك اِلا شرِيكا هو لك تملِكه وما ملك۔

''اللہ تعالیٰ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوا، آپ کا کوئی شریک نہیں مگر وہ جو آپ کی ملکیت میں ہیں۔ آپ ہی ان کے مالک ہیں اور وہ خود کسی چیز کے مالک نہیں۔''

الغرض مشرکین یہ مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق، کائنات اور اس کی ذات میں کوئی دوسرا شریک نہیں، محبت اور خوف کا تعلق بھی اسی خدائے واحد (اِلٰہ آسمانی) سے رکھتے تھے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات اور اسباب سے بالاتر افعال واشیا میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کی وجہ سے بتوں کو بھی بعض اختیارات حاصل ہیں جب چاہیں بنا ؤیا بگاڑ کر سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی پوجا کرتے تھے، عبادت والے اعمال یعنی سجدہ وطواف کرتے اور اپنے بتوں کے نام کی نذریں اور منتیں مانتے تھے، ان سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے انہی غلط وباطل عقائد اور اعمال نے انہیں گمراہ کر کے جہنم کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ پھر ان میں بعض اتنے احمق تھے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے بتوں اور مورتیوں سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کو عبادت، محبت اور تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دیتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اتعبدون ما تنحِتون﴾ (الصّٰفّٰت:۹۵)

یعنی ''کیا تم مورتیوں کی پرستش کرتے ہو جن کو تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا ہے۔''

بعض مشرک اتنے بے وقوف تو نہیں تھے کہ پتھر کی مورتیوں کی عبادت کرتے لیکن وہ کچھ حقیقی یا فرضی بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کو نفع وضرر کا مالک اور اپنا حاجت روا تسلیم کرتے تھے۔ عبادت وہ لوگ درحقیقت ان بزرگ ہستیوں کی کرتے تھے لیکن بتوں کو ان کی جلوہ گاہ یا نشانیاں سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔

www.darulemaan.com

﴿اِن الذِین تعبدون مِن دونِ اللہِ عِبادٌ امثالکم﴾(اعراف:۱۹۴)

''بے شک وہ جن کو تم پوجتے ہو وہ تمہاری ہی طرح ہمارے بندے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمان ربانی ہے:

﴿ اولٰئِك الذِین یدعون یبتغون اِلی ربِھِم الوسیلۃ ایّھم اقرب و یرجون رحمتہ و یخافون عذابہ﴾(بنی اسرائیل:۵۷)

''وہ لوگ جن کو یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب تک (قرب کا) وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ کون سا (راستہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے) زیادہ نزدیک ہے اور اس کی مہربانی کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔''

مخلوق خدا کی کثیر تعداد اسی طرح سے گمراہ ہو کر تباہ ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص ومقرب بندوں اور مقبول بزرگوں کی مورتیاں بنا کر ان کی عبادت میں لگ گئے۔ انسانیت کی پوری تاریخ پر اسی طرح مہلک مرض کے بدنما داغ موجود ہیں۔ حضرت نوح علیہم السلام سے لے کر آج تک اکثر اقوام عالم اسی طرح گمراہ ہو کر جہنم کا ایندھن بن گئیں۔ افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ومنتخب بندے جو شرک کی بیخ کنی اور توحید کی اشاعت کیلیے مبعوث ہوئے تھے جنہوں نے دنیا کو توحید کا درس دیا توحید کی تبلیغ کیلیے سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کیں، آروں سے چیرے گئے آگ میں ڈالے گئے لیکن اف تک نہ کی اور ہر حال میں اپنا فرض ادا کیا، مخلوق خدا کو شرک سے باز رکھنے کے لیے پوری پوری کوشش کرتے رہے۔ انہی بندگان خدا کو بعد میں آنے والے جاہلوں نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا۔ حضرات انبیاء علیہ السلام، صدیقین، شہدا اور صالحین کے بت بنا کر ان کی عبادت کرنے لگے۔

شرک فی العبادات پر تفصیلی بحث!

عبادت کی حقیقت اللہ تعالیٰ نے بعض تعظیمی کام اپنے لیے خاص کر کے مقرر فرمائے ہیں۔ جیسے

نماز، روزہ، نذر اور منت وغیرہ۔ ایسے اعمال کو عبادات اور قربات کہتے ہیں۔ عبادت شریعت کی اصطلاح میں کسی ہستی کو غیبی طور پر نفع ونقصان کا مالک اور حاجت روا سمجھ کر اسے راضی اور خوش کرنے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے انتہائی محبت اور تعظیم کے ساتھ اس کے سامنے بے حد شدید ترین اشد درجہ عاجزی وانکساری کے اظہار کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے سوا کوئی ایسی ہستی یا چیز نہیں جس کی عبادت شرعاً یا عقلاً درست ہو۔

شرک فی العبادات، شرک کی وہ قسم ہے جس میں انسان زیادہ مبتلا رہے ہیں عام طور پر رکوع و سجدہ، نذر ومنت اور قربانی جیسی عبادات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک ٹھہرایا گیا۔

غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے!

سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ خالقِ کون ومکان کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ خواہ وہ عبادت کی نیت سے ہو یا محض تعظیم وتکریم کی نیت سے۔ دونوں صورتیں باجماع امت حرام ہیں فرق صرف اتنا ہے جو عبادت کی نیت سے غیر اللہ کو سجدہ کرے گا وہ کافر ہو جائے گا اور جس نے محض تعظیم کے لیے سجدہ کیا، اکثر علما کے نزدیک اسے کافر نہیں کہا جائے گا لیکن ارتکابِ حرام کا مجرم فاسق کفر اور شرک کے قریب ہوا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ لا تسجدوا لِلشمسِ ولا لِلقمرِ واسجدوا لِلّٰهِ الذی خلقهن ﴾

''سجدہ نہ کریں سورج کو اور نہ چاند کو، اور سجدہ کرو اللہ تعالیٰ کو جس نے ان کو پیدا کیا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کا ایک معجزہ مروی ہے حضور ﷺ مہاجرین وانصار کی ایک جماعت کے ساتھ تھے کہ ایک اونٹ نے آ کر آپ ﷺ کو (اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ) سجدہ کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو درخت اور جانور سجدہ کرتے ہیں، ہم تو زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اپنے پروردگار کی عبادت کرو

www.darulfikr.com

اور اپنے بھائی کی (فقط) تعظیم کرو۔ اگر میں کسی کو اجازت دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (مشکوٰۃ باب عشر النسا) اسی طرح قیس بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حیرہ (اطراف کوفہ) کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ تو حضور ﷺ سے عرض کیا کہ حیرہ والے اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ تو زیادہ لائق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا اگر میری قبر پر تمہارا گزر ہو تو کیا تم میری قبر کو سجدہ کرو گے؟ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں آپ نے فرمایا:۔

((لاتفعلوا لو کنت امر احدا ان یسجد لِا حد لا مرت النِسا ان یسجدن لِازوجِھن جعل الله لھم علیھِن مِن حق)) (ابوداؤد)

''کہ سجدہ نہ کرو اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کا حق مقرر کیا ہے۔''

اسی روایت کو امام احمد نے بھی معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے۔ ان احادیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کے سوا کسی اور کے آگے سر رکھنا ممنوع ہے۔ سجدہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے کسی بھی شریعت اور امت میں حلال نہیں رہا، البتہ تعظیمی سجدہ قدیم شریعتوں میں جائز تھا۔ لیکن شریعت اسلامی میں غیر خدا کے لیے حتی کہ حضور ﷺ کے لیے بھی بالاتفاق سجدہ تعظیمی ممنوع اور حرام ہے۔

سجدہ تعظیمی والتحیہ کے بارے میں علما کی آراء!

سجدہ تعظیمی اور سجدہ تحیہ پر امداد المفتین میں ایک مفصل بحث جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

امام ابوبکر جصاص حنفی اپنی کتاب احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ سجدہ تعظیمی حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بحکم الٰہی جاری کیا گیا تھا اور سب سے پہلے ان کے لیے مشروع ہوا، پھر ان کی امت میں بھی

www.darulemaan.com

مشروع رہا ہے اور غالبا یہ سجدہ تعظیمی کی مشروعیت برابر باقی رہی یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بھی ان کے بھائیوں نے ان کو سجدہ کیا اور اس زمانہ میں یہ غایت تعظیم کے لیے کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں معانقہ تعظیما مشروع ہے۔ اسی طرح دست بوسی بھی بعض علما کے نزدیک بلا کراہت مشروع اور بعض مکروہ فرماتے ہیں مگر سجدہ کو شرع شریف نے کبھی کسی حالت میں کسی ذات کے لیے جائز نہیں کیا۔ اور نہ ہوسکتا ہے۔ اور سجدہ تعظیمی کی مطلقا ممانعت احادیثِ صحیحہ اور صریحہ سے قطعی طور سے ثابت ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اگر یہ سجدہ تعظیمی ان چیزوں کو کیا جاوے جن کو سجدہ کرنا خاص کفر کی علامت اور کفار کا شعار ہے جیسے بت یا پیپل کا درخت یا گنگا جمنا یا چاند سورج وغیرہ تو یہ سجدہ تعظیمی بھی باجماعِ امت اور باتفاق علماء کفر و شرک ہے۔ اس کا کرنے والا کافر مرتد ہے۔ اگرچہ اس کا مرتکب نیت عبادت کی نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ شریعت کے احکام ظاہر عمل سے متعلق ہیں نہ کہ نیات سے۔ البتہ ممکن ہے وہ عنداللہ سبحانہ مومن ہو، مگر احکام دنیا کے لحاظ سے اس کا مرتکب کافر شمار ہوگا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے، علامہ ابن احجر ہیثمی اپنی کتاب الاعلام بقواطع الاسلام میں شرح المواقف سے نقل فرماتے ہیں۔ جو (کوئی) نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو تسلیم کرے، اس پر ایمان لائے اور بایں ہمہ آفتاب کو سجدہ کرے تو وہ مومن نہیں ہے اس لیے کہ شمس کو سجدہ کرنے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن نہیں ورنہ وہ ایسی حرکت جو بظاہر کفر ہے اختیار نہ کرتا اور ہمارے ہاں حکم باعتبار ظاہر کے ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے مومن نہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں اگر ہم کو یہ امر محقق ہو جائے کہ وہ سجدہ عبادت کے لحاظ سے نہیں کرتا اور اس کا اعتقاد یہ نہیں کہ آفتاب اس کا رب ہے اور اس کا دل ایمان سے بھرپور ہے تو دیانتاً اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، لیکن قضاءً اس کو کافر کہیں گے اور تمام معاملات اس کے ساتھ وہی کیے جائیں گے جو کفار کے ساتھ کیے جاتے ہیں

www.alahazratnetwork.org

نیز کتاب الزوج مصنفہ ابن حجرؒ میں ہے کہ جو شخص کوئی ایسا کام کرے جو سوائے کافر کے کسی دوسرے کے صادر نہیں ہوسکتا تو وہ شخص کافر کہلائے گا (یعنی قضاءً نہ کہ دیانۃً) اگر چہ وہ اعلانیہ اپنے اسلام کو ظاہر کر رہا ہو جیسے یہودیوں کے کنسہ میں یہود کے ساتھ ان کے طریقے پر زنار وغیرہ پہن کر جانا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا کے غیر کو سجدہ کرنا عبادت کی نیت وارادہ سے یا ایسی نیت و کیفیت سے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ عبادت کے طور پر سجدہ کر رہا ہے اگر چہ وہ نیت عبادت کا منکر ہو تب بھی اس کا مرتکب بالاجماع کافر ہے۔

سجدہ تعظیمی کی دوسری صورت!

دوسرا سجدہ التحیہ وہ ہے جس میں قصد غیر اللہ کی عبادت کا نہ ہو اور سجدہ بھی ان اشیاء کی طرف نہ ہو جن کو کفار سجدہ کیا کرتے ہیں، اور جن کی طرف سجدہ کرنا کافروں شعار کا سمجھا جاتا ہے۔ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا کہ وہ بھی کفر ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ یہ حرام قطعی اور گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب قریب بالکفر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ردالمختار میں امام زیلعیؒ سے منقول ہے، اس سجدے کی وجہ سے کافر نہ ہوگا کیونکہ اس کی نیت عبادت کی نہیں بلکہ تعظیم وتحیہ مقصود ہے اور امام شمس الائمہ السرخسیؒ میں فرماتے ہیں کہ اس سجدے کی وجہ سے بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ غیر اللہ کو سجدہ بہ نیتِ تعظیم کرنا کفر ہے اور فتاوی ظہیریہ میں لکھا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے خواہ کسی نیت و قصد سے ہو انسان کافر ہو جاتا ہے۔ اور فقیہ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں سلطان اور بادشاہ کو سجدہ عبادت کی نیت سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ شخص جس نے سجدہ کیا (خواہ) اس وقت کوئی نیت نہ کی ہو۔ (یہ قول جوہر اخلاطی میں منقول ہے)

عالمگیری کتاب الکراہۃ میں لکھا ہے کہ جو بادشاہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم کرے اور زمین کو بادشاہ کے سامنے چومے کافر نہیں ہوتا مگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے۔

www.darulemaan.com

جو لوگ کہ سجدہ غیر اللہ کو مطلقاً کفر کہتے ہیں تو اس میں ایک جماعت کا مذہب یہ ہے۔ جیسے سجدہ آفتاب اور بت وغیرہ کو کرنا کفر ہے اسی طرح اپنے آباء و مشائخ کو مخلوقات میں سے اور اولیاء اللہ کے مزارات کو سجدہ کرنا کفر ہے۔ اسی طرح (خواہ کسی نیت وارادہ سے ہو) ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ آباء و مشائخ کے لیے سجدہ کرنا پہلی امتوں کے لیے جائز تھا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا (تو چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ کفر اور اس کے افعال کی اجازت کبھی کسی مذہب سماوی میں نہیں ہوئی) تو آباء و مشائخ عظام کو سجدہ کرنا بطور تعظیم کے کرنا مماثل و مشابہ سجدہ آفتاب و بت کے نہیں۔ کیونکہ آفتاب، بت و درخت وغیرہ جن کو سجدہ کرنا کفار کا شعار ہے، ان کی تعظیم کا امر اور ثبوت امم اسلامیہ ملل حقہ اور ادیان سماویہ میں کہیں بھی نہیں۔

الغرض چونکہ سجدہ تعظیمی آباء و مشائخ عظام کے لیے ہم سے پہلی شریعتوں میں مشروع تھا، اگرچہ ہماری امت کے لیے حرام قطعی ہو گیا مگر جواز سابق کی بناء پر اس کا فعل کفر ہونا مشتبہ ہو گیا اور یہ اصول مسلم ہے کہ اگر کوئی شبہ کسی کے کافر ہونے میں واقع ہو جائے تو اس پر حکم کفر ہونا جاری نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا جو آبا یا مشائخ کو سجدہ تعظیمی کرے اس پر حکم کفر نہیں لگایا جائے گا۔ اگرچہ وہ کافر ہونے کے قریب ہو جاتا ہے (کتاب الاعلام: ۳/۳۴۳)

دین اسلام کی شرک سے حفاظت!

جہاں اللہ پاک نے اس امت مرحومہ کو طرح طرح کی نعمتیں اور فضیلتیں عطا فرمائیں اور ﴿کنتم خیر امۃٍ﴾ فرما کر اس امت کی شان کو دوبالا کیا ہے، اسی طرح اس امت کے ساتھ نہایت رحمت کا معاملہ فرمایا ہے اور اس امت پر ایسے احکام نازل کیے ہیں، جن سے کہ امت کی گمراہی سے مکمل حفاظت ہو اور جب کسی چیز کو ممنوع کرنا منظور ہوا تو اس شئے کے لوازمات اور وہ تمام چیزیں حرام کر دی گئیں۔ جو کہ اس شئے تک پہنچنے کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ مثلاً زنا کو حرام کیا تو اس کے ساتھ ہی اس حرام فعل

کی طرف دعوت دینے والی اشیاء کو بھی ناجائز قرار دیا۔

بت پرستی حرام کی گئی تو اس کے ساتھ ہی جاندار کی تصویر بنانا اور رکھنا، یہاں تک کہ دیکھنا بھی ناجائز قرار دیا گیا۔ اور چونکہ آفتاب پرست لوگ سورج کو صبح شام پوجتے تھے لہٰذا سورج کے نکلنے کے وقت فجر کی نماز اور ڈوبنے کے وقت عصر کی نماز کو ممنوع قرار دیا۔ محض اس وجہ سے کہ آئندہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ یہ نمازیں سورج کی تعظیم کے لیے ہیں اور شرک کی برائی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ بلکہ ہماری روشن شریعت میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ الفاظ میں بھی اہل شرک سے ادنیٰ سی مشابہت پیدا نہ ہوتا کہ کبھی عرصہ دراز کے بعد یہ شرک کا سبب نہ بن جائے اور پہلی امتوں کی طرح یہ امت بھی ہلاک نہ ہو جائے چنانچہ فرمایا کہ غلام اپنے آقا کو یا رب! کہہ کر نہ پکارے، ادھر آقا کو بھی روک دیا گیا کہ وہ اپنے غلام کو یا عبدی کہہ کر آواز نہ دے۔

ان احکام ہی کی برکت سے یہ امت مرحومہ باوجود یہ کہ اپنی عمر کی چودھویں صدی ختم کر چکی ہے مگر دین میں زیادتی ونقصان اور شرک وکفر میں بفضلہٖ تعالیٰ ایسی مبتلا نہیں ہوئی جیسے پہلی امتیں اور اللہ کے وعدے کے مطابق ہمیشہ حفاظت میں رہے گی۔

﴿انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون﴾

مکمل حفاظت کی یہ نعمت اس امانت والی امت ہی کے لیے مخصوص ہے پہلی امتوں میں یہ نعمت احکام کے اعتبار سے کمال کی حد تک نہیں تھی۔

حرام چیزوں کی طرف دعوت دینے والی اشیاء حرام نہ تھیں چنانچہ ان کے لیے تماثیل اور تصاویر کا استعمال مباح تھا۔ انہوں نے اس میں زیادتی کی اور ہر نامور انسان کی تصویر کی تعظیم اور عبادت کرنے لگے یہاں تک کہ کفر وشرک میں مبتلا ہو گئے اس کے علاوہ بھی ہزارہا مثالیں اس کی موجود ہیں۔

الغرض اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ تحقیق اور حق سجدہ تعظیمی کے بارے میں یہ ہے کہ تعظیمی سجدہ

فی نفسہ کفر وشرک نہیں اسی وجہ سے پہلی امتوں میں جائز تھا البتہ کفر وشرک کا ذریعہ ضرور ہے اور صورت میں بھی کفر کا فعل ہے اور اسی وجہ سے یہ سجدہ تعظیمی میں پہلی امتوں اور پہلے زمانے میں شرک کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اور وہ لوگ اس کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور آخرت میں ہمیشہ کے عذاب کے مستحق ہوئے۔

پس خداوند قدوس کی بے پایاں رحمت اور لطف وکرم کا تقاضا ہوا کہ اس بہترین امت پر انعام کیا جائے اور ہدایت کو ہمیشہ باقی رکھنے اور گمراہی سے نجات کے لیے یہ مناسب ہے کہ کفر وشرک کے ذریعوں کو بھی ناجائز اور ممنوع قرار دیا جائے، اگرچہ کسی ذریعہ کا کفر وشرک کے ساتھ دور کا تعلق ہو۔ اسی وجہ سے تعظیمی سجدہ کا جواز منسوخ ہو گیا اور امت محمدیہ ﷺ کے لیے سجدہ تعظیمی کو ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دیا گیا۔

الغرض بیس صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے:

((ما ينبغي لِبشر ان يسجد لِبشر ولو صلح لِبشر ان يسجد لِبشر لامرت المرأة ان تسجد لِزوجِها مِن عظمِ حقِه عليها)) ۱؎

اور جو حدیث دس صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو وہ موافق قول راجح ومختار متواتر ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی اعلیٰ درجہ کی متواتر حدیث ہوگی۔ اگر کوئی متواتر تسلیم نہ کرے تو مشہور ہونے کا منکر نہیں ہو سکتا اور مشہور حدیث سے آیت کریمہ کا نسخ جائز ہے جیسا کہ کتب اصول میں وضاحت کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں اجماع امت یہی ہے کہ سجدہ تعظیمی حرام ہے اور کسی امام یا مجتہد، فقیہ کا زمانہ سلف اور خلف میں اس کے بارے میں اختلاف مذکور نہیں بلکہ اجماع تام اس کی حرمت پر ہے۔

۱؎ اس حدیث شریف کے الفاظ اور ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

www.darulemaan.com

سجدہ بیت اللہ!

پس اسی اصول کے مطابق بیت اللہ شریف کو بھی سجدہ کرنا کفر ہے۔ درمختار میں ہے:

لو سجد للکعبۃِ نفسھا کفر یعنی اگر کعبہ ہی کو سجدہ کیا تو کافر ہو جائے گا۔

علامہ ابن عابدین المعروف بالشامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یعنی اگر سجدہ اللہ کو ہو اور کعبہ کی طرف منہ ہو، اس کا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور ((کان السجود لِنفسِ الکعبۃِ کفر)) یعنی اگر کعبہ ہی کو سجدہ کیا تو یہ کفر ہے۔ (شامی جلد اول کتاب الصلوٰۃ)

اب جب کہ بیت اللہ شریف کے لیئے سجدہ کرنا ناجائز ہے اور محبوب خدا حضرت محمد ﷺ کی قبر مبارک کے لیے سجدے کی اجازت نہیں تو کسی اور کی قبر کے لیے تو سجدہ کا سوال ہی پیدا نہی ہوتا۔ سجدہ یا رکوع تو بہت بڑی بات ہے ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے کی اجازت بھی نہیں دی گ ء۔ علامہ شامی رحم اللہ لکھتے ہیں: فِی الزاھِدِی الإیماء فِی السلامِ اِلی قربِ الرکوع، کالسجدۃِ۔ یعنی سلام کرتے وقت رکوع کے قریب جھک جانا سجدے کی طرح ہے۔

اور فتاوی عالمگیری میں ہے:

الإ نحناء للسلطانِ اولغیرہ مکروہ لِانہ یشبہ فعل المجوسِ کذافِی جواھِرِ الإخلاطِی و یکرہ الإنحناء عِند التحِیۃِ وبہ وردالنھی کذافِی التمر تاشِی (۳۶۹/۵)

یعنی بادشاہ وغیرہ کے لیے بھی جھکنا مکروہ ہے کیونکہ یہ مجوسیوں کے فعل سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ جواہر اخلاطی میں ہے کہ سلام کے وقت جھکنا مکروہ ہے اور اس پر منع وارد ہوئی ہے۔

زیارتِ قبور!

بلاشبہ زیارت قبور جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ انسان عبرت حاصل کرتا ہے اور آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دل نرم ہو جاتے ہیں لیکن قبر والے ہی سے کوئی چیز طلب کرنا یا قبر کی طرف رخ کر

www.darulemam.com

کے نماز پڑھنا، قبر کو ہاتھ وغیرہ لگا کر اپنے بدن پر ملنا، قبر کو بوسہ دینا اور اس کا طواف کرنا وغیرہ افعال شریعت اسلامی میں ناجائز اور ممنوع ہیں۔ علماء حضرات کا فرض ہے کہ حسب توفیق عوام کو زیارت کرنے کا صحیح طریقہ بتلائیں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی کہی زیارت کے لیے جائے اس پر کفر و شرک کے فتوے لگائیں البتہ ناسمجھ اور بے علم لوگوں کو بے مہار چھوڑ دینا بھی ظلم ہے کہ جو ان کے جی میں آئے کرنے لگیں اور محض قبروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر سجدے کرنے لگیں اور شرک میں مبتلا ہو جائیں، جیسا کہ مشرکین عرب کرتے تھے۔ وہ لوگ بعض ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں لیکن ان کا اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق ہے اور راس کے کارخانہ قدرت میں ایسا عمل و دخل ہے کہ وہ عوام کی تکلیفیں دور کر سکتے ہیں۔ دولت، عزت، صحت اور اولاد جیسی چیزیں دے سکتے ہیں پس ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت اور پرستش کیا کرتے اور ان سے اپنی حاجتیں پوری کرنے کی درخواستیں کرتے۔ قرآن پاک نے ان کے اسی عقیدے کو شرک قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نہ کرے کہ ہماری سادہ لوح عوام ایسی خرافات میں مبتلا ہو جائیں۔ پھر تو مشرکین عرب اور ان کے عقیدے میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور نتیجہ دنیا و آخرت کی تباہی اور نقصان کے سوا اور کیا ہوگا۔ (اللھم نعوذ بک من ذلک)

غیر اللہ کے لیے نذر!

نذر، منت اور قربانی عبادات میں سے ہیں اور اسی لیے خاص اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے نام پر نذر یا منت کا ماننا حرام و ناجائز ہے، نہ ہی غیر اللہ کے نام پر ذبح یا قربانی کرنا جائز ہے، اس قسم کے سارے افعال مشرکانہ اور باطل ہیں۔ چنانچہ خلاص الفتاوی صفحہ جلد میں ہے:

النذر لِغیرِ اللهِ حرام لِانه مِن انواعِ الکفر لِان هذا عِبادة والعِبادةلِغیرِ اللهِ کفر.

''غیر اللہ کے لیے نذر حرام ہے۔ کیونکہ یہ کفر کی ایک قسم ہے۔ وہ اس طرح کی نذر ایک عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کفر ہے۔''

www.darulfeeman.com

بحرالرائق اور ردالمختار میں ہے:

والنذر لِلمخلوقِ لا یجوز لِانه عبادة والعِبادة لا تکون لِلمخلوقِ (شامی جلد۲ کتاب الصوم)

یعنی ''مخلوق کے نام پر نذر ماننا جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے نہیں ہوسکتی۔''

قرآن مجید میں چار مقامات پر غیراللہ کے نام ذبح کو حرام فرمایا گیا ہے ارشاد ہے:

﴿اِنما حرم علیکم المیتة والدم و لحم الخِنزِیرِ ومآ اھِّل بِه لِغیرِ اللهِ﴾

''اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف حرام کیا ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس پر غیراللہ کا نام پکارہ جائے۔''

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیفہ میں درج تھا:

((لعن الله من ذبح لِغیرِ اللهِ)) (رواہ مسلم) اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو غیراللہ کی نیت سے جانور ذبح کرے۔

شریعت نے اس بارے میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ جانور کو ضیافت اور مہمان نوازی کے علاوہ صرف کسی حاکم اعلیٰ کے سامنے اس کی تعظیم کے طور پر ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے کو ناجائز بتایا ہے۔

(دیکھئے جامع الرموز: ۴۴۹) ردالمختار، مجمع الانہر، فتاوی بزازیہ، زاہدی اور بحرالرائق وغیرہ میں یہ مسئلہ صاف اور تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

مہمان کے لیے جانور ذبح کرنے میں کوئی اشکال (یا الجھن) نہیں، کیونکہ یہاں صرف مہمان کی عزت اور تکریم مراد ہوتی ہے محض خون بہانا مقصود نہیں ہوتا اسی طرح قصاب کا ذبح کرنا گوشت حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے فقط خون بہانا مقصود نہیں ہوتا، جب کہ حاکم اعلیٰ وغیرہ کے لیے خون بہانا اصل مقصد ہوتا ہے اور گوشت کا درجہ دوسرا ہوتا ہے اسی لیے اس کی تعظیم کی خاطر اس کے سامنے جانور کو

www.darleeman.com

ذبح کیا جاتا ہے۔

اب قاعدہ واضح ہو گیا کہ جہاں خون بہانا مقصد ہو اور گوشت کا حاصل کرنا دوسرے درجہ میں ہو تو وہاں غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا حرام ہے اور اگر گوشت کا حصول اصل ہو جس کے لیے خون بہانا ضم نا ہو تو یہ جائز اور درست ہے۔

ناجائز یا مشتبہ رسم!

اس قاعدے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں جو رسم ورواج کافی مدت سے چلتے آرہے ہیں کہ کسی سے معذرت اور معافی مانگنے یا کسی سے امداد ونصرت طلب کرنے کی خاطر اس کے گھر کوئی جانور بکرا وغیرہ لے جاتے ہیں اور اسے اپنے ہاتھوں سے اس کی چوکھٹ یا گھر میں ذبح کرتے ہیں تو ایسی مذبوحہ کو اگر حرام نہ بھی کہا جائے کم از کم مشتبہ ضرور کہا جائے گا۔لیکن اب سوال یہ ہے کہ مجرم اپنے ساتھ بیسیوں شرفا اور دوسرے لوگوں کو جرگہ کے طور پر مظلوم اور مجروح کے گھر لے جاتے ہیں تو ان سب کی مہمانی اور ان کے لیے تکلف کرنے کا بار مظلوم اور مجروح کے سر کیوں تھوپ دیا جائے۔

اس مشکل کا آسان حل یہ ہے کہ مظلوم اور مجروح کو کوئی جانور بکرہ وغیرہ ھدی پیش کیا جائے اور مجرم اور جرگہ والے اس کے ذبح کرنے کے تکلف کی بجائے مظلوم فریق کی صوابدید پر چھوڑ دیں، خواہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یا انہی مہمانوں کی تکریم اور ان کو کھلانے کے لیے ذبح کر ڈالے تو ایسی صورت میں ذبیحہ بلا اشتباہ حلال ہو جائے گا۔

ایصالِ ثواب

اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر اور اللہ تعالیٰ ہی کی رضا اور خوشنودی کے لیے تلاوت کرے یا نوافل پڑھے، صدقہ وخیرات یا قربانی کر کے اس کا ثواب اپنے اقربا، اساتذہ یا مشائخ کو بخش دے، یہ جائز ہے، ان کو یہ ثواب پہنچ جاتا ہے۔

www.nafseislam.com

نذر!

اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر نذر مانے مثلاً یوں کہے کہ اگر میرا یہ فلاں کام ہو گیا تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر زید [1] کو اتنی اتنی چیزیں دوں گا (بشرطیکہ زید مسکین ہو تو یہ نذر بھی جائز ہے۔ بلکہ اگر جس شئے کی نذر مانی گئی ہے وہ اس مخصوص آدمی کو بھی نہ دیں، دوسرے فقرا کو دے دیں تو بھی جائز ہے فقہا کے اقوال میں تفصیل واضح طور پر موجود ہے)۔

www.darulleeman.com

---

[1] اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر اتنی رقم یا غلہ وغیرہ فلاں شیخ، بزرگ، خانقاہ یا مدرسہ وغیرہ کے فقرا پر تقسیم کروں گا اس کا ثواب فلاں شیخ یا بزرگ کو بخش دوں گا تو یہ بھی جائز ہے۔ البتہ اگر کام پورا ہو جانے کے بعد وہ ان متعین فقرا کے بجائے دوسرے فقرا پر تقسیم کر دے تو اس کی نذر پوری ہو گئی اور اس کا ثواب اس شیخ یا بزرگ کو ملے گا۔

www.daruleeman.com

باب دوم

دست بوسی یعنی ہاتھ چومنا!

کسی اللہ والے عالم یا زاہد کے ہاتھ پاں چومنے کے بارے میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے جبکہ بعض کے نزدیک اگرچہ فی نفسہ جائز ہے لیکن بعض برائیوں کو روکنے کی خاطر منع فرماتے ہیں اور دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ایک تو وہ جسے ابن شیبہ وابن ماجہ وغیرہ نے نقل کیا ہے دوسری جامع ترمذی کی روایت ہے:

((عن انس رضِی اللہ عنہ قال قال رجل یارسول اللہ ﷺ، الرجل مِنا یلقی اخا ہ او صدِیقہ اینحنِی لہ؟ قال لا ، قال افیلتزِمہ و یقبّلہ؟قال لا .قال فیاخذ بِیدِہ و یصافِحہ؟ قال نعم، ھذا حدِیث حسن .))(الترمذی ج۲ ابواب الادب)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملے اور (تعظیماً) جھکے؟ آپ نے فرمایا نہیں (دوبارہ سوال کرکے)، کہا کہ اسے گلے لگائے اور بوسہ دے؟ فرمایا نہیں۔(انہوں نے تیسری بار) کہا، اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا حضور ﷺ نے ''ہاں''۔

احادیث وآثار سے جوازِ دست بوسی!

لیکن بعض صحیح احادیث اور آثار رضی اللہ عنہم سے اس کا جواز بلکہ بعض اوقات مستحب ہونا بھی ثابت ہے۔چند احادیث کو وآثار کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱): ترمذی میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے مدینہ منورہ میں آنے کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، حدیث کے آخر میں وہ فرماتی ہیں کہ:((فاعتنقہ و قبّلہ)) یعنی ''آپ ﷺ نے

(زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو گلے لگایا اور چوما۔ ؎۱ (الترمذی باب الادب)

(۲): سنن ابی داود میں عبد القیس کے وفد کے بارے میں حضرت زراع بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم مدینہ منورہ پہنچے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترے، ((فنقبل ید رسولِ اللہِ او رِجلہ)) اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں مبارک کو بوسہ دیا۔

اسی قصہ کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں حضرت مزید عبدی اور نافع عبدی رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی نقل کیا ہے (کذا فی مجمع الزوائد ج۹ ص۳۹۰) جس میں ہے کہ ((فدنونا مِن النبِی ﷺ فقبّلنا یدیہ)) یعنی ہم آپ کے پاس آئے اور آپ کے دونوں ہاتھوں کو بھوسہ دیا۔ (ابوداوٗد کتاب الادب ج۲)

اسی قصہ کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں حضرت مزیدۃ عبدی رضی اللہ عنہ اور نافع عبدی رضی اللہ عنہ کی سند سے بھی نقل کیا ہے۔ (کذا فی مجمع الزوائد: ۹/۳۹۰)

(۳): طبرانی نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب ان کی معافی کے بارے میں آیت نازل ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے: ((فاخذ بِیدِہ فقبّلھا)) اور آپ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا دست مبارک پکڑا اور اسے چوما ؎۲ (مجمع الزوائد: ۸/۴۲)

(۴)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: انہ قبّل ید النبِی ﷺ انہوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک چومے۔ ؎۳ (مجمع الزوائد: ۸/۴۲)

(۵)۔ جمع الفوائد جلد صفحہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو بوسہ دیا اور موصل کے رہنے والے

۱؎ قال الترمذی ھذا حدیث حسن غریب لا نعرفہ من حدیث الزھری الامن ھذا الوجہ.

۲؎ قال الھثیمی و فیہ یحی بن عبد الحمید الحمانی وھو ضعیف.

۳؎ قال الھثیمی رواہ ابو یعلی و فیہ یزید بن ابی زیاد وھو لین الحدیث و بقیتہ رجالہ رجال الصحیح.

www.darulehsan.com

والے سے بتایا کہ بڑی نرمی کے ساتھ بوسہ دیا۔(حیاۃ الصحابہ:۲/۵۸۳)

(۶):حضرت ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بڑے خوش مزاج شخص تھے۔آپ ایک مرتبہ حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے بات کر رہے تھے اور انہیں ہنسا رہے تھے کہ آپ نے ان کے پہلو کو ایک لکڑی سے چھیڑا۔اس پر حضرت اُسید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا بدلہ لے لو۔انہوں نے عرض کیا، کہ آپ تو کُرتہ پہنے ہوئے ہیں اور میرے جسم پر کُرتہ نہیں تھا۔راوی کہتے ہیں:

((فرفع عن قمِیصِه فاحتضنه وجعل یقبّل کشحه)) تو آپ ﷺ نے قمیص مبارک اٹھادی اور اسید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور آپ ﷺ کے پہلو کو بوسہ دینا شروع کر دیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہو جائیں میں نے تو بدلہ سے اسی کام کا ارادہ کیا تھا[۱] (مستدرک :۲/۲۸۸)اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی حضرت اُسید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔(دیکھئے ابوداؤد:۲ ج کتاب الادب باب فی قبل الجسد)

(۷):ترمذی ونسائی وغیرہ میں صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دو یہودی آئے اور انہوں نے آیات بینات کے بارے میں سوال کیا۔اس حدیث میں یہ بھی ہے:

فقبّلوا یدیهِ ورِجلیهِ وقالوا نشهد اِنك نبِیٌّ .

کہ انہوں نے آپ ﷺ کے ہاتھوں اور پاں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں۔ہذا حدیث حسن صحیح۔

اس حدیث کو امام ترمذی نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اس (یعنی بوسہ دینے) کے باب میں یزید بن

۱؎قال الحاکم هذا حدیث حسن صحیح الاسناد ولم یخرجاه ووافقه الذهبی فقال صحیح و اخرجه الطبرانی فی الکبیر عن اسید بن حضیر و مثله کما فی کنز العمال:۷/۲۰۸

www.darulemaan.com

اسود، ابن عمر اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم سے بھی روایتیں موجود ہیں۔ [۱] (الترمذی ابواب الادب)

(۸): سنن ابی داود وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث افک، کی روایت ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری برا اور صفائی قرآن مجید میں بھیج دی تو مجھے میرے والدین فرمایا:

قومی فقبّلی رأس النبی ﷺ۔ اٹھ اور آپ ﷺ کے سر مبارک کو بوسہ دے۔ (ابوداد کتاب الادب جلد۲)

(۹): حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عمر اور ابن جابر رضی اللہ عنہم سے مرفوعا ابوداود شعبی سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب حبشہ سے لوٹے اور آپ ﷺ سے ملے:

فالتزمه وقبّل ما بين عينيهِ تو حضور ﷺ نے انہیں گلے لگایا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ (ابوداود ج۲ کتاب الادب)

(۱۰): حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا۔

((یقبّل عثمان ابن مطعون وهو ميت حتى رايت الدموع تسِيل))

عثمان بن مطعون رضی اللہ عنہ کو بوسہ دے رہے تھے۔ جب کہ وہ وفات پا چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ (ابوداؤد کتاب الجنائز ج۲)

اسی قسم روایت معاذ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی گئی ہے [۲] اور اس حدیث کو امام ترمذی حضرت

---

۱ ۔ قال ابو عيسى الترمذي وفي الباب عن يزيد بن الاسود و عمر و كعب بن مالك ، و في سنن ابن ماجه عن صفوان بن عسال ان قوما من اليهود قبلوا يدالنبي ﷺ ورجليه (ابن ماجه كتاب الادب)

۲ ۔ وفي مجمع الزوائد عن معاذ ابن ربيعه قال رايت رسول الله ﷺ قبل عثمان بن مظعون رواه البزار و اسناد ه حسن (مجمع الزوائد باب تقبل الميت ۳/۲۰)

www.naturemen.com

عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کر کے فرماتے ہیں:

((وفِی البابِ عنِ ابنِ عباس و جابِرٍ و عائِشة رضِی الله عنهم قالوا اِن ابابکر قبّل النبِی صلی الله علیهِ وسلم وهو میت.))

یعنی ابن عباس، جابر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو بوسہ دیا جب کہ وہ رحلت فرما چکے تھے اور آخر میں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے۔

علامہ الہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں ایک طویل حدیث میں حضور ﷺ کے دنیا سے رحلت فرمانے کا واقعہ یزید بن بابنوس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مسند امام حنبلؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے جس میں بیان ہے:

ثم جاء ابو بکر رضی ا لله عنه فرفع الحِجاب فنظر اِلیهِ فقال اِنا للهِ واِناالیهِ راجِعون مات رسول اللهِ صلی الله علیهِ وسلم ثم اتی مِن قِبلِ راسِه وحدرفاه قبّل جبهَتَه ثم قال وانبِیا ه ثم رفع وحدر فاه قبّل جبهته وقال واصفِیّاه ثم رفع راسه وحدر فاه قبّل جبهته وقال وا خلِیلاه ....قال الهیثمِی رحمه الله ورِجال احمدَ ثِقاتٌ.(مجمع الزوائد ص ۳۱تا۳۲ج۹)

''پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور پردہ اٹھایا، آپ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی طرف دیکھا اور فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون، رسول اللہ ﷺ رحلت فرما گئے۔ پھر آپ ﷺ کے سرہانے آ کر اپنا منہ جھکایا اور حضور ﷺ کی پیشانی مبارک کو چوما۔ پھر کہا ہائے میرے نبی! پھر اپنا سر اٹھایا اور منہ جھکا کر آپ ﷺ کی پیشانی مبارک کو بوسہ دے کر کہا ہائے میرے خالص دوست! پھر تیسری مرتبہ سر اٹھایا اور پھر منہ جھکا کر حضور ﷺ کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور فرمایا ہائے میرے خلیل!۔

یہاں تک تو صرف وہ روایات اور واقعات بیان کر دیئے گئے ہیں جن میں حضور ﷺ نے کسی کو بوسہ دیا یا کسی اور نے حضور ﷺ کو چوما۔ اب بعض ایسے واقعات اور آثار پیش کئے جاتے ہیں جن میں

www.darulemam.com

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور دوسرے سلف صالحین نے ایک دوسرے کی دست بوسی کی ہے اور ان کو کسی نے منع نہیں کیا ہے۔

(۱۱): حضرت امام بخاریؒ الادب المفرد میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پیر چومتے تھے۔ (باب تقبیل الرجل)

(۱۲): تمیم بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے، ان کا استقبال حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کیا اور ان کا ہاتھ چوما اس حدیث کے آخر میں ہے کہ حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہاتھ کا چومنا سنت ہے۔ [۱]

(۱۳): طبرانی نے یحیٰ الحارث الذماری سے روایت ہے کیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے ملا ان سے کہا کہ آپ نے اس ہاتھ سے حضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی ہے؟ انھوں نے فرمایا، ہاں میں نے عرض کیا تو اپنا ہاتھ مجھے دیجئے تا کہ میں اسے بوسہ دوں تو انھوں نے میری درخواست کو منظور کر لیا اور میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ [۲] (رواہ طبرانی)

(۱۴): اور طبرانی نے معجم اوسط میں جید سند سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

بايعت النبى صلى الله عليه وسلم بيدى هذه فقبّلنا ها فلم ينكر ذلك.

یعنی میں نے اسی ہاتھ سے حضور ﷺ سے بیعت کی تو ہم (سننے والوں) نے ان کا یہ ہاتھ چوما اور انہوں (یعنی سلمہ بن اکوع) نے اس (چومنے) کو برا نہ مانا۔ [۳] (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

---

۱ ۔ اخرجه عبد الرزاق والخرائطى فى مكارم الاخلاق والبيهقى وابن عساكر كذافى كنز العمال ٩/٢٢٠. ٢ ۔ رواه طبرانى وفيه عبدالمالك القارى لم اعرفه وبقية رجاله ثقات كذافى مجمع الزوائد: ٨/٤٢ . ٣ ۔ قال الهيثمى وفى الصحيح منه البيعة رواه الطبرانى فى الاوسط ورجاله ثقات مجمع الزوائد: ٨/٤٢

www.alulama.com

(۱۵): حضرت عمار ابن ابی عمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک روز سوار ہونے لگے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے (تکریماً) ان کے گھوڑے کی رکاب تھام لی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اے رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹے! آپ ہٹ جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمیں اپنے علماء اور بڑے لوگوں کے ساتھ اسی طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذرا مجھے اپنا ہاتھ تو دکھایئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ نکالا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کو چوم لیا اور کہا کہ ہمیں اپنے نبی ﷺ کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ [1]

(۱۶): بیہقی وغیرہ نے غزوہ روم کے طویل سفر کا واقعہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس میں یہ ہے کہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں سمیت لوٹ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور جب پوری سرگزشت سنائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔ [2]

(۱۷): حضرت سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی سنت ہے۔ اسی مجلس میں عبداللہ بن مبارک موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔ [3]

مذکورہ بالا روایات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ متقی عالم یا شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دینا فی نفسہ جائز اور بعض اوقات مستحسن ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت جس سے ممانعت معلوم ہوتی ہے، اول تو وہ مذکورہ بالا روایت کو منسوخ نہیں کر سکتی کیونکہ اس حدیث کو ناسخ ثابت کرنے کے لئے

---

۱ ـ اخرجه ابن عساكر كنزالعمال ص۳۹۶/۱۳. ـ۲ اخرجه البيهقى وابن عساكر كذافي كنزالعمال ج ۷ص ٦١ ، حياة صحابه ۳۱۹/۱. ـ۳ فى تبيين الحقاق للعلامه عثمان بن على الزيلعىؒ ، وقال سفيان الثورى تقبّل يدالعالم و يدالسلطان العادل سنة فقام عبد الله بن مبارك فقبّل راسه (بيان الحقائق ص ٥ ج٦ كتاب الكراهية)

دلیل یا قرینے کی ضرورت ہے۔ یہاں تو حضور ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم و تابعین تک سے جواز بلانکیر ثابت ہے دوسرے یہ کہ خود اسی حدیث میں ممانعت کا ایک قرینہ موجود ہے اور وہ یہ کہ سوال ایک عام دوست یا مسلمان کے بارے میں پوچھا گیا ہے۔ کسی متقی عالم یا سلطان عادل کے بارے میں نہیں۔ پس یہ ممانعت خاص صورت میں ہے اور ریہ بات بعید از تاویل اور محض قیاس آرائی نہیں۔

چومنے کے اسباب ومحرکات!

کیونکہ بوسہ دینے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔

(۱): نفسانی شہوت سے چہرہ وغیرہ چومنا جو کہ اپنی بیوی یا مملوکہ کنیز کے علاوہ کسی اور کے سارے فقہائے امت کے نزدیک ممنوع اور ناجائز ہے۔

(۲): بُزرگانہ شفقت کی وجہ سے مثلاً والدین اپنے بچوں کو چومتے ہیں یا کوئی اپنے چھوٹے بھائی وغیرہ کو پیشانی پر بوسہ دیتا ہے۔ حضور ﷺ سے حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے بدن کو بوسہ دینا اور اسی طرح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پیشانی کو بوسہ دینا ثابت ہے یہ بھی بلا اختلاف جائز ہے۔

(۳): تعظیم وتکریم کے لیے علماء ومشائخ کے ہاتھ یا پیشانی کو چومنا بہ سبب ان کے دینی شرف کے اس کا جواز تو مذکورہ بالا روایات سے ثابت ہی ہے۔

(۴): حصول دنیا کے لیے مثلاً کسی مالدار آدمی یا صاحب اقتدار کے ہاتھوں کو چومنا یا محض رسماً ایک دوسرے کے ہاتھ اور پیشانی کو بوسہ دینا۔ یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۵): حکم شریعت کی وجہ سے مثلاً حجر اسود کو بوسہ دینا جو بالاتفاق جائز اور مسنون ہے۔ یہ اسباب سمجھ لینے کے بعد یہ بات بآسانی واضح ہو جاتی ہے کہ منع والی حدیث کو صرف پہلی اور چوتھی قسم پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ خود منع والی حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام بخاریؒ نے الادب

www.darulfeman.com

المفرد میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابن جدعان رضی اللہ عنہ نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تم نے نبی اکرم ﷺ کو اپنے ہاتھ سے چھوا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں تو آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ (الادب المفرد باب تقبیل الید ص ۲) اب تو کوئی شک نہیں رہتا کہ ممانعت فقط مذکورہ دو صورتوں کے ساتھ خاص ہے، ورنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو کبھی دست بوسی کی اجازت نہ دیتے۔ پس منع اور جواز، دونوں اقسام کی احادیث میں موافقت اور تطبیق ہو سکتی ہے اور کوئی تضاد یا تعارض باقی نہیں رہتا۔

فقہاء کا مسلک!

اسی تاویل کی بنا پر فقہاء اور علماء کرام نے مشائخ و علماء کی دست بوسی کو جائز اور مستحسن قرار دیا ہے چنانچہ علامہ ابوبکر بن المسعود الکاسانی (المتوفی ۵۸۷ھ) بدائع الصنائع صفحہ ۱۲۴ جلد ۵ کتاب الاستحسان اس مسئلے کے بارے (مختصراً) یوں لکھتے ہیں:

چومنے اور گلے لگانے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ کسی مرد کے لیے دوسرے مرد کے منہ ہاتھ یا کسی اور عضو کو چومنا یا اس سے معانقہ کرنا مکروہ ہے۔ جب کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں اور دلیل میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ والی روایت پیش کرتے ہیں جبکہ وہ حبشہ سے واپس ہوئے تو حضور ﷺ نے انہیں گلے لگایا اور پیشانی کو بوسہ دیا اور نبی کریما کا فعل کم از کم حلال و مباح ہوتا ہے اسی طرح یہ روایت کیا گیا ہے کہ جب حضور ﷺ کے اصحاب سفر سے واپس آتے تو ایک دوسرے کو بوسہ دیتے اور گلے لگاتے تھے اس کے برعکس ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا آپس میں ایک دوسرے کو چوما کریں؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا گیا کہ ایک دوسرے سے معانقہ کیا کریں؟ کہا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا آپس میں مصافحہ کیا کریں؟ تو فرمایا، ہاں۔

شیخ ابومنصورؒ (ماتریدی) نے فرمایا کہ معانقہ اس صورت میں مکروہ ہے جبکہ ایسے طرز پر ہو جو شہوت کے ساتھ عریانی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس سے (محض) احسان اور اکرام مقصود ہو تو

www.darulfeman.com

مکروہ نہیں اور یہی حکم بوسہ دینے کا ہے۔ جو بوسہ، شہوت کے بوسہ کی مانند ہو وہ تو ممنوع ہے اور رنہ مباح (جائز ہے) اور ابو یوسفؒ نے جس حدیث سے استدلال کیا وہ اسی صورت پر محمول ہے (کہ اس میں شہوت کا خطرہ یا مشابہت نہ ہو)۔

(۲): بحرالرائق میں بحوالہ نوادر لکھا ہے کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی میں مضائقہ نہیں جیسے کہ سفیان ثوریؒ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ عالم اور عادل سلطان کے ہاتھ کو بوسہ دینا سنت ہے (بحرالرائق: ج۸ ص۱۹۴)

(۳): فتاوی عالمگیری میں ہے کہ ایک مرد کو دوسرے مرد کے منہ پر بوسہ دینا یا اسکے ہاتھ یا بدن کے کسی حصے کو چومنا ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق مکروہ ہے۔ اور ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ بوسہ دینے اور معانقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور جب قمیص اور جبہ کے اوپر سے (معانقہ) ہو اور بطور احسان و اکرام کے بوسہ ہو، جو شہوت نہ ہو تو سب کے نزدیک جائز ہے۔

(۴): اور درمختار میں ہے: وفِی الحقائِقِ لوالقُبلة علی وجهِ المبرّةِ جاز بِالِاجماع.
(الدرالمختار علیٰ هامش ردالمختار ص ٢٤٤ ج٥)

یعنی "حقائق میں ہے اگر بوسہ دینا بطور احسان و اکرام کے ہو تو بالاجماع[۱] جائز ہے۔"

(۵): ۔علامہ شامی فرماتے ہیں:

---

[۱] وفی الدرالمختار ولا بأس بتقبیل ید الرجل العالم والمتورّع علی سبیل التبرک ونقل المصنف عن الجامع انه لا بأس بتقبیل یدالحاکم المتدین والسلطان العادل وقیل سنة مجتبیٰ وتقبیل راسه ای العالم اجود کمافی البزازیة ولا رخصته فیه ای تقبیل الید لغیر عالم وعادل، هوالمختار مجتبیٰ وفی المحیط ان لتعظیم اسلامه واکرامه جاز وان لنیل الدنیا کره(الدرالمختار علی هامش ردالمختار ص۲۴۵ ج۵)

www.darulehsan.com

قدّم مِن الخانِیةِ والحقائِقِ ان التقبِیل علی سبِیلِ البِرِّ بِلا شهوةٍ جائِزٌ بِالِاجماعِ.

(٦): حضرت شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، دست بوسی میں فقہاے کرام مختلف ہو گئے ہیں۔ امام مالکؒ نے اس کے جواز سے انکار کیا ہے اور ان روایات سے بھی جو اس میں آئی ہیں جب کہ دوسرے فقہاء حضرات نے اس کی اجازت دی ہے اور انہوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جس وقت وہ لوگ جہاد سے واپس ہوئے انہوں نے کہا (یارسول اللہ ﷺ) ہم فرار ہونے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا (ایسا نہیں) بلکہ تم حملہ پر حملہ کرنے والے ہو اور (آپ ﷺ نے فرمایا) میں مسلمانوں کی جماعت ہوں (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔

دست بوسی کے جواز میں چند احادیث نقل کر کے آگے فرماتے ہیں کہ الابجریؒ فرماتے ہیں کہ امام مالک نے جو بوسہ کو مکروہ قرار دیا ہے یہ اس وقت ہے جبکہ تکبر اور بڑائی کی وجہ سے ہو۔ اور جب اللہ تعالی کے تقرب کے لیے ہو یا اس شخص کے علم یا شرافت کی وجہ سے ہو تو یہ جائز ہے۔ آخر میں امام محی الدین نوویؒ کے قول پر ختم کر کے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے:

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کسی کی دست بوسی اس کے زہد، صلاح یا علم یا شرافت یا صیانت (یعنی خود کو گناہوں سے بچانا، متقی ہونا) یا اسی طرح اور کسی دینی بات کی وجہ سے ہو تو مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے اور اگر (دست بوسی) اس کی مالداری اور اہل دنیا کے ہاں اس کی شان و شوکت اور مرتبہ مقام کی وجہ سے ہو تو یہ شدید ترین مکروہ ہے اور ابو سعید متولی فرماتے ہیں کہ جائز نہیں۔

اور درمختار میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دست بوسی تعظیم اور شرفِ اسلام اور اکرام کی وجہ سے ہو تو جائز، اور اگر دنیا کے حصول کے لیے ہو تو مکروہ ہے۔ (دیکھئے الدر المختار علی ہامش رد المحتار ص ۲۴۵ ج ۵)

(۷) علامہ عینیؒ نے تقبیل کے مسئلہ پر بہت مختصر اور جامع بیان کر کے آخر میں فرمایا ہے لیکن یہ

www.darureiman.com

سب کچھ جواز اس وقت ہے جبکہ (دست بوسی وغیرہ) بطور احسان اور اکرام کے ہو اور جب یہ (دست بوسی وغیرہ) شہوت کی وجہ سے ہو تو میاں بیوی کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے بوسہ دینے اور معانقہ میں ابو حنیفہ اور محمد (رحمہم اللہ) کا جو اختلاف منقول ہے اور وہ اسی صورت میں ہے جب کہ یہ افعال ایسے طریقے پر ہوں جس میں شہوت کا خطرہ اور اشتباہ پایا جائے اور جہاں یہ صورت نہ ہو اور نہ ہی حصول دنیا یا محض رسم مقصود ہو تو سب کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔

بوسہ کی دو صورتیں!

ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی از خود کسی کے ہاتھ وغیرہ کو چوم لے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زید سے مطالبہ کرے کہ آپ ہاتھ یا پاؤں مجھے چومنے کے لیے دیں۔ کیا زید کے لیے جائز ہے وہ ہاتھ یا پاؤں پھیلا کر لوگوں کو اس کا موقع دے؟ ایسی حالت میں بعض فقہاء کرام منع فرماتے ہیں کہ زید ہاتھ پاؤں پھیلائے، کیونکہ یہ صورت ایک متکبرانہ فعل ہے جس سے تکبر پیدا ہو جانے کا احتمال غالب ہے۔ اگر چہ حقیقۃً اس میں تکبر اور عجب نہ بھی ہو۔ پس بعض نے تو زید کے لیے ہاتھ پاؤں پھیلانے کو مکروہ قرار دیا ہے [1] اور بعض نے اصل فعل کے جواز پر نظر کر کے اس کو جائز فرمایا ہے

---

[1] فی الهندیه، طلب اوزاهدان یدفع الیه قدمه لیقبّله لایر خص فیه ولایجیبه الی ذالك عندالبعض و ذکربعضهم یجیب الی ذالك. و فی ردالمختار تحت قوله اجابه لمااخرجه الحاکم ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول الله ﷺ أرنی شیئا ازدادبه یقیناً فقال اذهب الی تلك الشجرة فادعها فذهب الیها فقال ان رسول الله ﷺ یدعوك فجات حتی سلمت علی النبی ﷺ فقال لها ارجعی فرجعت ثم اذّن فقبّل راسه ورجلیه وقال لو کنت امر احد یسجد لاحد لامرت المراة ان تسجد لزوجها وقال صحیح الاسناد من رساله الشربنلالی (ردالمختار: ۵/۲۴۵)

البتہ ازخود زید کے ہاتھ پاؤں چومنا بلا اختلاف جائز ہے۔

ایک شبہ!

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ دست بوسی وغیرہ اگر جائز بھی ہو جائے تو اگر اس کیلیے جھکنے کی صورت پیش آئے تو وہ انحنا یعنی جھکنے کی وجہ سے بھی مکروہ ہو جائے گا۔لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہاں جھکنا چومنے کے لیے ہوگا، جھکنا خود مقصود نہیں۔جیسے کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جائے اور کوئی جھک کر اسے اٹھالے،اس جھکنے میں کسی کو بھی کلام نہیں کیونکہ یہ جھکنا رکوع سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے س لیے کہ اس میں جھکنا مقصود نہیں بلکہ چیز اٹھانا مقصود ہے۔

زمین بوسی!

فقہ کی کتابوں میں دو مسئلے اور بھی ایسے ہیں جن کی وضاحت مناسب ہے تاکہ مختلف مسائل آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔

(۱):ایک یہ کہ کوئی شخص دوسرے آدمی سے مصافحہ کرنے کے بعد خود اپنے ہی ہاتھ کو چوم لے۔اس فعل کو فقہاء کرام نے مکروہ اور ناجائز قرار دیا ہے۔

(۲):کسی عالم یا بزرگ کے سامنے زمین کو بوسہ دینا فقہائے کرام اس کو حرام اور ممنوع فرماتے ہیں۔ایسے کام کرنے والا اور اس پر راضی ہونے والا دونوں سخت مجرم اور گناہگار ہیں۔کیونکہ یہ کام بتوں کے پوجنے اور عبادت کرنے سے مشابہت [۱] رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ:

---

۱ ؎ومایفعله الجهال من تقبیل ید نفسه اذا لقی الغیر فهو مکروه فلارخصته فیه ومایفعلون من تقبیل الارض بین یدی العلماء فحرام الفاعل والراضی به آثمان لانه یشبه عبادة الا وثان(تبیین الحقائق:٦/٥،کتاب الکراهیة کذافی البحر الرائق والفتاوی الهندیةو الدرالمختار و غیرها ۵/۲۷۱)

www.darulieman.com

(۱): اگر ہاتھ وغیرہ کو بوسہ دینا شہوت وغیرہ کے ساتھ ہو یا کسی جانب میں شہوت پیدا ہو جانے کا خطرہ یا اشتباہ ہو تو بالاتفاق اپنی بیوی یا زرخرید کنیز کے سوا کسی کے ساتھ جائز نہیں۔

(۲): چھوٹوں پر شفقت ورحم یا متقی علماء اور بزرگوں کے اکرام اور تعظیم کے لیے بوسہ بالاتفاق جائز اور ثابت ہے بشرطیکہ جس کی دست بوسی کی جائے اس کو اس عمل سے تکلیف نہ ہو اور نہ ہی اس کے نفس میں تکبر وعجب پیدا ہوتا ہو۔ ایسی حالت میں دوسری جانب کیلئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو دست بوسی کا موقع دے۔

(۳): دنیاوی اقتدار اور حصول عزت کے لئے کسی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ چومنا ناجائز وممنوع ہے۔

(۴): محض رسم اور عادت کے طور پر بھی درست نہیں اور نہ اس میں حد سے تجاوز کرنا چاہیے کہ ہر وقت گلے ملنے لگیں یا بوسے دینے لگیں بلکہ کسی کے سفر سے واپسی یا رخصت کے موقع پر یا عرصہ دراز کے بعد ملاقات وغیرہ پر اللہ تعالیٰ کی محبت کے غلبہ کی وجہ سے اور سادگی اور بغیر پابندی وبغیر تکلف کے علماء اور بزرگوں کے ہاتھ یا پیشانی کو بوسہ دینا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

www.darulemaan.com

www.daruleeman.com

باب سوم: ''قیام''

قیام کی قسمیں!

کسی آدمی کے لیے کھڑا ہو جانے کی چند قسمیں ہیں۔

(۱): اول: کوئی سفر سے آنے والے کے استقبال کے لیے کھڑا ہو۔

یا آنے والے کو کسی چیز کی بشارت یا خوشخبری دینے کے لیے کھڑا ہو۔

یا پھر کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کی غرض سے۔

یا جگہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھڑا ہونا۔

محبت کی وجہ سے ایسے شخص کے لیے جس کے ساتھ محبت جائز ہو مثلاً مسلمان بھائی۔

اور کسی کی مدد کرنا، اعانت کرنا یا خدمت کی نیت سے کھڑا ہونا، مثلاً مریض کو سواری سے اتارنا چڑھانا یا تھامنا وغیرہ۔

قیام کی یہ سب صورتیں بالاجماع جائز ہیں، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۲): قیام کی دوسری قسم: کسی کے آگے ایسے طریقے سے کھڑا ہونا جیسے عجمیوں کا دستور تھا کہ بڑا آدمی بیٹھا ہوتا اور اس کے سامنے یا ارد گرد باقی لوگ کھڑے رہتے قیام کی یہ صورت بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۳): تیسری قسم: کوئی شخص دل میں یہ چاہت اور خواہش رکھے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہو جایا کریں۔ اس کے بارے میں شدید وعید آئی ہے اور بالاتفاقِ امت یہ خواہش اور آرزو ناجائز اور ممنوع ہے۔

www.ahlehaq.com

(۴): چوتھی قسم: کسی آدمی کے لیے صرف تعظیم وتکریم کے طور پر کھڑا ہو جانا، اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے لیکن یہ کوئی کفر و شرک جیسا شدید اختلاف نہیں بلا شبہ نماز میں کھڑا ہونا عبادت ہے لیکن ہر قسم کا قیام عبادت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ﴿ قوموا لِلهِ قانِتِين ﴾ کھڑے رہو اللہ کے سامنے کے تحت لایا جا سکتا ہے۔

اس لیے نماز کی تمام حرکات وسکنات عبادت ہیں۔ اگر یہ ساری حرکات نماز سے باہر بھی مطلقاً عبادت یا عبادت کے مشابہ سمجھی جائیں تو اس طرح کسی کے سامنے دوزانو ہو کر التحیات کی صورت میں بیٹھنا ناجائز ہو گا۔ حالانکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے ہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور حضور ﷺ کے سامنے دوزانوں ہو کر باادب بیٹھے۔ [1]

علماء اور مشائخ وغیرہ کے سامنے دوزانو باادب بیٹھنا کسی کے ہاں ناجائز نہیں، بالاجماع امت جائز بلکہ مستحب ہے۔

اسی طرح کسی کے سامنے مطلقا قیام بھی ممنوع نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بہت سی صورتوں میں کسی کے لیے کھڑا ہونا بالاتفاق جائز بلکہ بعض اوقات مستحب ہے۔ مسلمان بھائی اور مہمان کے اکرام کا ہمیں حکم [2] دیا گیا ہے۔ اسی طرح اپنے بڑوں، علماء اور مشائخ کی توقیر اور تعظیم کا حکم بھی ہے۔[3]

۱ ـ فاسند ركتبيه الى ركتبيه ووضع كفيه على فخذيه.............(رواہ البخاری ومسلم)

۲ وعن ابن مسعودؓ قال اذا اكرم الرجل اخاه فانما يكرم ربه (مجمع الزوائد ص١٦ ج٨) عن النبى ﷺ انه قال من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليتق الله وليكرم جاره و فى رواية من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه ثلاث مرات (رواه احمد مجمع الزوائد).

۳ ـ و عن عبادة بن الصامتؓ ان رسول الله ﷺ قال ليس من امتى من لم يجل كبيرنا ـ الحديث وعن ابن عباس رضى الله عنه يرفعه النبى ﷺ قال ليس منا من لم يوقر الكبير. (الحديث رواه احمد ،مجمع الزوائد ص١٤ ج٨)

www.qaulemam.com

احترام کا طریقہ!

اب ہم کسی کا احترام اور تعظیم کیسے کریں؟ احترام کے حدود کیا ہیں؟ شریعت اسلام نے ہمیں ان کے واضح جوابات دیئے۔ بعض جگہ روایات کے ظاہری تعارض اور دلائل کی بنا پر علماء میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے اس قسم کے اختلاف کے لیے بھی فقہا کے ہاں حدود متعین ہوتے ہیں۔ بعض کے ہاں کوئی چیز سنت یا مستحب ہوتی ہے جب کہ دوسروں کے نزدیک وہ واجب یا اس کے برعکس مکروہ ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ فقہاء کرام کے متعینہ حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے اختلاف کو اپنے حدود کے اندر رہنے دیں۔ الغرض قیام کی چوتھی قسم کے بارے میں علماء کا اختلاف صرف جائز اور مکروہ کی حد تک ہے۔ اور جو لوگ اسے مکروہ فرماتے ہیں وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

(۱): حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

لم یکن شخص احب اِلیھم مِن رسول اللہ ﷺ وکانوا اِذا راوہ لم یقوموا لِما یعلمون مِن کراھتِہ لِذالِك. ھذا حدِیث حسن غرِیب (ترمذی ابواب الادب)

یعنی صحابہ کرام کے لیے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی بھی محبوب نہ تھا (اسکے باوجود) جب صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو دیکھتے تو آپ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ کو یہ بات پسند نہیں۔

(۲): ابومجلز رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نکلے تو حضرت عبداللہ بن زبیر ابن صفوان رضی اللہ عنہم ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے:

((فقال اِجلِسا سمِعت رسول اللہِ صلی اللہ علیہِ والِہِ وسلم یقول مِن سرّہ ان یتمثل لہ الرِجال قِیاما فلیتبوا مقعدہ مِن النارِ. (وفی الباب عن ابی امام وھذا حدیث حسن الترمذی ابواب الادب)

www.darulemaan.com

پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹھ جا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے) تعظیماً کھڑے ہوں پس وہ اپنا گھر جہنم میں بنالے۔

حضرت امام ترمذیؒ اور دیگر حضرات فقہاء نے ان احادیث سے قیام کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔

اب جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ پہلی حدیث کے جواب میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو صحابہ کا کھڑا ہونا، بے تکلفی، شدید محبت و تعلق اور تواضع کی بنا پر ناپسند تھا. اس کے جواب میں قیام سے منع کرنے والے حضرات فرماتے ہیں کہ بے تکلفی کا مطلب یہ نہیں کہ اکرام نہ کیا جائے (اب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بظاہر کونسی چیز مانع تھی؟) اور قیام کو جائز سمجھنے والے جواب یوں دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کو یہ کراہیت طبعی کراہیت تھی نہ کہ شرعی کراہیت۔ جس طرح کہ آپ ﷺ کو یہ پسند نہ تھا کہ سب سے آگے چلیں۔ حالانکہ آگے چلنا کسی کے نزدیک ناجائز نہیں ہے، تو یہاں بھی کراہیت طبعی مراد ہے نہ یہ کہ شرعا مکروہ ہے۔

دوسری حدیث کے جواب میں قیام کے موافقین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تو قیام کی خواہش کرنا ممنوع ہے۔ یعنی اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں اور اس خواہش کی وجہ عجب و تکبر ہے۔ پس یہ خواہش تو بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے (جیسا کہ تیسری قسم کے بیان میں گزر چکا ہے)۔

لیکن اس پر شبہ کیا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک فقیہ صحابی ہیں انہوں نے تو رسول اللہ ﷺ کے قول مبارک سے ممانعت ہی مراد لی ہے اس لیے تو انہوں نے منع فرمایا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کی یہ ان کے تواضع اور تقویٰ کی وجہ سے تھا۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں وہ اس حدیث کی وعید میں نہ آجائیں۔ کیونکہ وعید اسی کے لیے ہے جس کے لیے قیام کیا جاتا ہے، کھڑے ہونے والوں کے لیے تو نہیں ہے۔ لیکن اس پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ لوگوں کا کھڑا ہونا سبب بن جاتا ہے خواہش قیام کا، تو جس طرح خواہش قیام ممنوع ہے۔ اسی طرح اس کا سبب بھی ممنوع ہے لیکن یہ شبہ درست نہیں، کیونکہ یہاں

www.ahlehaq.com

قیام کی خواہش ممنوع ہے چاہے لوگ از خود کھڑے ہوں یا نہ ہوں۔ اب اگر لوگ کسی آدمی کے لیے کھڑے نہ ہوں لیکن اس کی خواہش ہو کہ لوگ کھڑے ہوں تو یہ شخص اس وعید کے تحت آئے گا۔

بہر حال وعید صرف خواہش قیام پر وارد ہوتی ہے جس کی غرض لوگوں میں اپنے مرتبے کو دیکھنا ہے جو کہ تفخر اور تکبر ہے۔

(۳):اخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متکئا علی عصا فقمنا لہ فقال لا تقوموا کما یقوم الاعاجم یعظم بعضا بعضا (ابوداود کتاب الادب ج۲)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم ان کے لیے کھڑے ہوگئے پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم (اس طرح) مت کھڑے ہو جس طرح عجمی لوگ بعض کچھ (دوسروں) کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

(۴):حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو حضرت ابوبکر (اللہ ان پر رحم کرے) نے فرمایا کھڑے ہوجاتا کہ ہم حضور ﷺ کے پاس اس منافق کے بارے میں استغاثہ دائر کریں۔

((فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایقام انما یقام للہ تبارک وتعالی.))

''آپ ﷺ نے فرمایا کسی اور کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہیے صرف اللہ کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔[1]''

بلاشبہ یہ دونوں حدیثیں کھڑا ہونے کو واضح طور پر منع کرتی ہیں لیکن حدیث نمبر۳ سے قیام کو ناجائز سمجھنے والے صرف وہ قیام مراد لیتے ہیں جو عجمیوں کا دستور تھا مثلاً ترکوں وغیرہ اقوام عجم کی یہ عادت

[1] رواہ احمد و فیہ راولم یسم وابن لھیعتہ وثقہ احمد وغیرہ وضعفہ یحی القطان وغیرہ، وھو حسن الحدیث علی ما شذرات الذھب بن العماد وقدترجم لہ فی نحو صفحۃ.(مجمع الزوائد ص۴۰ج۸۔)

www.darulEman.com

تاریخ سے معلوم ہے کہ ایک (بڑا) آدمی بیٹھا رہتا اور اس کے سامنے دوسرے کھڑے رہتے۔اسی طرح طبرانی نے اوسط میں انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک ضعیف حدیث بھی نقل کی ہے:

اِنما هلك من قبلكم بِانهم عظموا ملوكهم بِان قاموا وهم قعود .

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اس طرح تباہ ہوگئیں کہ وہ اپنے بادشاہوں کی تعظیم کرتے تھے اس طرح کہ وہ کھڑے رہتے اور بادشاہ بیٹھے رہتے اسی مسلم کی ایک صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حالتِ بیماری میں بوجہ عذر بیٹھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم پیچھے کھڑے ہوئے نماز میں مشغول تھے تو جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

ان كِـدتـم انِـفا تفعلون فِعل فارِس والرومِ يقومون على ملوكِهِم وهم قعود.(مسلم كتاب الصلوة ج١ص١٧٧)

کہ ''تم عنقریب فارس اور روم کے لوگوں کا فعل کرو گے۔کھڑے ہوتے ہیں اردگرد اپنے بادشاہوں کے اور وہ (بادشاہ) بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔''

ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ممنوع وہ قیام ہے جو عجمیوں کا دستور ہے کہ کوئی شریف تو بیٹھا رہے اور رعام لوگ اس کے اردگرد تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔قیام کے مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کھڑا ہونا عجمیوں کی طرح تو نہیں تھا بلکہ وہ محض آپ ﷺ کی عزت و تکریم کیلئے کھڑے ہوتے تھے) اور پھر رسول اللہ ﷺ نے باوجود ان کے اخلاص کے، انہیں کو گویا منع فرمادیا۔

---

۲ چنانچہ علامہ ابن قیم فرماتے، والثـالـث ان يكون المقتدى جالس والناس قائمين فهذا طريق الا عاجم یعنی تیسرا یہ ہے کہ مقتدی آدمی بیٹھا ہو اور لوگ اسکے سامنے یا اردگرد کھڑے ہوں یہی دستور عجمیوں کا ہے (عرف الشذی علی سنن الترمذی کتاب ابواب الادب) رواه الطبرانى فى الاوسط وفيه الحسن قيتبه وهو متروك.

www.darulemam.com

اس کے جواب میں قیام کو جائز کہنے والے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو عجمیوں کی طرح کھڑے ہونے کی خبر دے رہے تھے اور (صرف اسی) طریقے سے منع فرما رہے تھے (یعنی ان کی نقل سے منع کر رہے تھے۔ پس ادب و عزت سے کھڑا ہونا جائز ہے کیونکہ اس کی وجہ صرف خلوص و محبت ہے)

باقی رہ گئی حدیث نمبر، اس کے بارے میں قیام کو جائز سمجھنے والے جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث بہت کمزور ہے۔ اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو پھر بھی یہ عجمیوں کے قیام پر محمول ہے کیونکہ وہ صورتیں جو قسم نمبر کے ذیل میں بیان ہو چکی ہیں بالاتفاق جائز ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قیام کی ممانعت صرف اسی قیام کی ہے جو عجمیوں کی رسم ہے جس کی طرف متعدد احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ قیام بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔

اب جو علماء حضرات قیام کے جواز کے قائل ہیں وہ مندرجہ ذیل احادیث کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔

حدیث نمبر ۵: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گفتگو اور نشست و برخاست میں اتنا زیادہ مشابہت جتنا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رکھتی تھی۔

اِذا دخلت علیہِ قام اِلیھا فاخذبیدِھا فقبّلھا واجلسھا فِی مجلِسِہ وکان اِذا دخل علیھا قامت اِلیہ فاخذت بِیدِہ واجلسہ فِی مجلِسِھا (ابوداود کتاب الادب ج۲)

یعنی جس وقت فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتی، آپ ﷺ اس کے لیے کھڑے ہو جاتے، اس کا ہاتھ پکڑتے اور بوسہ دیتے اور اپنے بیٹھنے کی جگہ پر اسے بٹھاتے۔ اور جب آپ ﷺ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے تو وہ آپ کی طرف کھڑی ہو جاتی، آپ کا ہاتھ مبارک پکڑتی اس کو بوسہ دیتی اور آپ کو اپنی جگہ پر بٹھا دیتی۔ قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ یہ قیام دونوں جانب سے قیام محبت اور قیامِ

استقبال ہے جو بالاتفاق جائز ہے لیکن قیام کو جائز سمجھنے والے اس جواب کو رد کر کے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا قیام تو قیامِ محبت ہوسکتا ہے، لیکن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قیام تو تعظیم وتکریم ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قیام بھی قیامِ محبت واستقبال مان لیا جائے تو بعید از قیاس بات نہیں۔ اگر چہ اس میں تعظیم وتکریم کا قوی احتمال موجود ہے۔

قیام کے قائل حضرات زید بن حارثہ، عکرمہ، بن ابی جہل، عدی بن حاتم، اسامہ بن شریک اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ کی روایات وواقعات سے بھی استدلال کرتے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۶):۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب مدینہ آئے تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر معانقہ کیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ (رواہ الترمذی ج ابواب الادب)

(۷): اور جب عکرمہ رضی اللہ عنہ یمن سے واپس ہو کر مدینہ منورہ آئے تو آپ ﷺ ان کیلئے کھڑے ہوئے، گلے لگایا۔[۱] (رواہ الطبرانی)

(۸): عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ کھڑے ہوتے یا حرکت فرماتے۔[۲]

(۹): اور حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے لیے کھڑے ہوئے اور ہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک کو بوسہ دیا۔[۳]

(۱۰): اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے لیے اٹھے اور ان کے دست مبارک کو چوما۔[۴]

---

[۱] مجمع الزوائد ص ۳۸۵ ج ۱　[۲] مشکل الاثار ص ۳۷ ج ۱　[۳] فتح الباری ص ۴۵ ج ۱۱ وقال سند قوی۔
[۴] فتح الباری ج ۱۱ ص ۴۵۔

www.darleeman.com

(۱۱): اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ جب قبول ہوئی، اسی قصہ میں آیا ہے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھ کر دوڑے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصافحہ کیا اور انہیں مبارک باد دی۔ (مشکل الآثار ص ۳۷ ج ۱)

اسی طرح کے اور بھی بہت سے واقعات اور روایتیں احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ لیکن قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کا قیام، سفر سے آنے کی خوشی کی وجہ سے تھا اور عدی وعکرمہ رضی اللہ عنہم اپنے علاقہ کے رئیس [۱] تھے اور آپ ﷺ نے تالیف قلب کے لیے قیام فرمایا اور ان کی مدارت کی تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں یا پھر اس لیے کہ آپ ﷺ نے آثار سے ان کو اس کا متوقع پایا، اس لیے کھڑے ہوئے۔ اسی طرح کے اور احتمال بھی ہو سکتے ہیں۔ الغرض اسی طرح کی تمام احادیث اور روایات کو قیامِ استقبال، قیامِ محبت، خوشی اور بشارت کے لیے کھڑا ہونا یا تعزیت کے لیے قیام قرار دے کر استدلال کرتے ہیں۔ اور یہ احتمالات اتنے بعید بھی نہیں، اگرچہ بعض روایات میں اکرام کا پہلو زیادہ واضح ہے۔

(۱۲): جیسا کہ حضرت ہلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب باہر تشریف لاتے تو ہم آپ کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے: حتی یدخل بیته جب تک کہ آپ ﷺ گھر تشریف نہ لے جاتے۔ [۲]

[۱] بلکہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ تو سفر سے آئے تھے تو ان کے لیے یہ قیام فرمانا استقبال کی وجہ ہو سکتا ہے اور عدی رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ضعیف ہے اور حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے مشہور الفاظ جو روایت ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ جب میں آپ ﷺ کے ہاں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ (حرکت کر کے میرے لیے جگہ کی) وسعت فرماتے۔

[۲] رواه البزار و هكذا وجدته فيما جمعته ولعله عن محمد بن هلال عن ابيه عن ابى هريرة رضی اللہ عنہ وهو الظاهر فان هلالا تابعى ثقته روى عن محمد بن ابى هلال عن ابيه عن جده وهو بعيد ورجال البزار ثقات. مجمع الزوائد ص ٤٠ ج ٨ وفى مشكل الآثار للامام جعفر الطحاوىؒ عن محمد ابن هلال عن ابيه عن ابى هريرة رضی اللہ عنہ نحوه (مشكل الآثار ص ٣٨ ج ٢)

www.darulemaan.com

قیام کے مخالفین اس کے کئی جوابات دیتے ہیں یہ قیام بوجہ ضرورت تھا ہر شخص اپنے اپنے کام کیلئے جانا چاہتا تھا۔ یا چونکہ نبی کریم ﷺ کے گھر کا دروازہ مسجد میں تھا اور مسجد فراخ نہ تھی اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ با آسانی گھر تشریف لے جا سکے۔ یا ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم خدمت کے لئے تیار ہوں۔ یعنی یہ قیام قیام خدمت تھا۔

(۱۳): قیام کو جائز قرار دینے والے حضرات سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث جس کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے سے استدلال کرتے ہیں، اسی حدیث سے امام بخاری، مسلم اور ابوداود نے بھی استدلال کیا ہے وہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہود بنو قریضہ اس وعدہ پر اترے کہ جو فیصلہ بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کریں گے، وہ انہیں قبول ہوگا (تو) رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا، وہ آپ ﷺ کے قریب ہی تھے، پس گدھے پر سوار ہو کر آئے:

فلما دنا مِن المسجِدِ قال رسول اللهِ صلى الله عليهِ وسلم لِلانصارِ قوموا اِلى سيدِكم (البخارى كتاب الاستيذان ، مسلم كتاب الجهاد)

یعنی جس وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ مسجد کے قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ اپنے سردار کے لیے کھڑے ہو جا۔

اس کے جواب میں قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ یہ حکم قیامِ تعظیمی کے لیے نہ تھا بلکہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ زخمی تھے اور ان کی مرہم پٹی کی گئی تھی، ان کو گدھے سے اتارنے کے لیے آپ ﷺ نے لوگوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ یہ قیام مدد اور معاونت کے لیے تھا۔ اگر یہ قیام تعظیمی ہوتا تو یوں فرماتے :قوموا لِسيدِكم ۔یعنی اپنے سردار کی خاطر کھڑے ہو جا، بلکہ بعض روایات میں زیادہ وضاحت بھی آئی ہے کہ:قوموا اِلى سيدِكم فانزِلوه ۔اپنے سردار کی طرف اٹھو اور ان کو سواری سے اتارلو۔ مخالفینِ قیام کے اس استدلال کا جواب موافقین حضرات یوں دیتے ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ ان کے پاس جا کر ان کی

www.darulfeeman.com

تعظیم وتکریم کے لیے سواری سے اتار لو۔

اور اس بات پر قرینہ آپ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ اپنے سردار کی طرف اٹھو (کھڑے ہو) تو لفظ سید سے ان کی تعظیم کی طرف اشارہ ہے۔

فقہاء کرام کے اقوال!

مذکورہ بالا روایات میں قیام کی ممانعت اور جواز یعنی دونوں جانب بحث وکلام کی کافی گنجائش موجود ہے اور علماء کرام نے ان پر بہت طویل بحثیں کی ہیں۔ حضرت نوویؒ نے قیام کے جواز پر پوری کتاب لکھی ہے اور طبرانی وغیرہ نے اس کے جواز میں روایات وواقعات نقل کر کے ان روایات کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن سے قیام کی ممانعت معلوم ہوتی ہے اور ان کی عمدہ تاویلیں بھی فرمائی ہیں۔

(۲): ابن الحاج وغیرہ نے اختلافی قیام کے ناپسند ہونے کو ثابت کرنے کے لیے پوری تفصیل سے مدلل بحث کی ہے اور انہوں نے حضرت امام نووی کے پورے رسالہ کو اپنی کتاب مدخل میں نقل کر کے اس سے عمدہ جوابات دیے ہیں۔ جن کو فتح الباری نے بہت جامع اور مختصر انداز سے نقل کیا ہے۔

جمہور علماء نے اہلِ فضل حضرات کے آنے پر اُن کے اکرام کے لیے کھڑے ہونے کو جائز بلکہ مستحب فرمایا ہے۔

(۳): چنانچہ مجمع البحار میں ہے:

واحتج بِهِ الجماهِير لِإكرامِ اهل الفضلِ بِالقِيامِ إذا اقبلوا(مجمع البحار ص ۱۸۲ ج۳)

یعنی جمہور علمائے کرام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اہلِ فضل کے اکرام کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے جب وہ آئیں۔

(۴): اور درمختار میں ہے آنے کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا جائز بلکہ مستحب ہے۔

www.darulemam.com

(۵):اور حضرت امام حجر فرماتے ہیں:

ورجح المنذری ماتقدم مِن الجمعِ عن قتیبة والبخارِی اِن القِیام المنھِی عنه ان یقام علیهِ وھو جالِس(فتح الباری ص۳۹ ج۱۱)

یعنی منذری نے حضرت قتیبہ اور بخاریؒ سے (منع اور جواز کی روایات و واقعات میں) جو تطبیق کی گئی ہے جو پہلے ذکر ہوچکی (اس کو) پسند فرمایا ہے اور ترجیح دی ہے (یعنی کسی مسلمان بھائی کے اکرام کے لئے قیام جائز ہے) اور ممنوع وہ قیام ہے کہ (کسی شخص کے اردگرد یا سامنے) لوگ کھڑے ہوں اور وہ بیٹھا ہو۔

(۶):طحاوی شرح درمختار میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علماء تعظیم کے لیے کھڑا ہونے میں مختلف ہو

گئے ہیں۔بعض نے منع کیا ہے بوجہ ابوداود کی حدیث کے جو انہوں نے ابوامامہ سے روایت کی ہے پھر اس کو پورا نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ بعض نے اس (قیام) کو جائز کہا ہے۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے قیام کرتے تھے اور بعضوں نے اس میں تفصیل کی ہے جیسے قاضی خان فرماتے ہیں [۱]:

قوم یقرون القرآن مِن لمصاحِفِ او یقرأ رجل واحِد فدخل علیھِم واحِد مِن الاجِلّةِ والا شرافِ فقام القارِی لِاجلِه قالوا دخل علیهِ عالِم اوابو ہ او استاذه الذِی علمه العِلم جاز له ان تقوم لِاجلِه وفِیما سِوی ذلِك لا یجوز... وفِی مجمع الفتاوی لِلانطا کِی

۱؎فتاوی قاضی خان ص۳۷۶ ج۴ وقال الملا علی قاریؒ ھکذا احتج با لحدیث جماھیر العلماء۔ وقال القاضی عیاض القیام المنھی تمثلھم قیاما طول جلو سه۔ وقال النوویؒ ھذالقیام للقادم من اھل الفضل مستحب و قدجاء ت الاحادیث ولم یضح فی النھی عنه شئی۔

قِیام القائِمِ جائِز اِذا جآء اعلم مِنه او استاذه الذِی علمه القرآن اوِالعِلم اوابوه اوامه لا یجوز لِغیرِ هِم واِن کان الجآءِ مِن الاجِلةِ ولاشرافِ ونقل الشرنبلالِی عنِ ابنِ وهبان ما نصه اقول فِی عصرِ نایِنبغِی ان یستحِیب ذٰلِك ایِ القِیام ۱ ؎ (الطحطاوی علی الدر المختار ص ۱۹۲ ج ٤)

یعنی کوئی قوم یا فرد تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو اور اس پر کوئی اہل فضل وشرف میں سے داخل ہو جائے تو علماء فرماتے ہیں کہ اگر وہ عالم ہو یا اس کا والد یا اس کا استاد تو اس (قرآن پڑھنے والے) کے لیے جائز ہے کہ ان کے لیے کھڑا ہو جائے اور ان کے سوا کسی دوسرے کے لیے کھڑا ہونا درست نہیں۔اور مجمع الفتاوی انطا کی میں ہے

کہ جب اس سے زیادہ عالم یا اس کا ایسا استاد جس نے اس کو قرآن مجید یا علم سکھایا ہو، یا اس کا باپ یا ماں آجائے تو ان کے لیے کھڑا ہونا جائز اور ان کے علاوہ اور کسی کے لئے جائز نہیں، اگرچہ آنے والا اہل فضل وشرف والا ہو۔اور شرنبلائی نے ابن وہبان سے نقل کیا ہے جس پر انہوں نے تصریح کی ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں یہ کھڑا ہونا مستحب ہونا چاہیے۔

(۷): اور ردالمختار میں اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال فِی القنیةِ قِیام الجالِسِ فی المسجِدِ لِمن دخل علیهِ تعظِیما وقِیام قارِیِ القرآنِ لِمن یجِیء تعظِیما لا یکره اِذا کان مِمن یستحِق التعظِیم وفِی مشکِلِ الآثارِ القِیام لِغیرِهِ لیس بِمکروه لِعینِهِ اِنما المکروه محبة القِیامِ لِمن یقام له فاِن قام لِمن لا یقام له لا یکره ۔

یعنی قنیہ میں ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا ایسے آدمی کے لیے کھڑا ہونا جو اس پر داخل ہو اور تلاوتِ قرآن کرنے والے کا ایسے آدمی کے لیے جو اس کے پاس آئے، تعظیماً کھڑا ہونا مکروہ نہیں، جبکہ

۱ ؎ وفی البنایه شرح الهدایه للعلا مه العینی ص ۲۵۵ ج ٤ نحوه ۔

www.dawateislami.com

وہ تعظیم کا مستحق ہو اور حضرت امام طحاویؒ کی کتاب مشکل الآثار میں ہے کہ غیر کے لیے کھڑا ہونا بذات خود مکروہ نہیں بلکہ مکروہ قیام کی محبت وخواہش ہے ایسے شخص کے لیے جس کے لیے (لوگ) کھڑے ہو جایا کرتے ہیں اور اگر (کوئی) کھڑا ہو گیا ایسے آدمی کے لیے جس کے لیے (لوگ) کھڑے نہیں ہوا کرتے تو مکروہ نہیں۔

آگے جا کر فرماتے ہیں کہ:

وما ورد مِن التوعد عليهِ فى من يحِب القِيام بين يديهِ كما يفعله التُّر كُ والاعاجِمُ.۱؎

اور جو وعید (حدیث شریف میں) اس پر (قیام پر) آئی ہے تو وہ ایسے شخص کے بارے میں ہے جو اپنے سامنے لوگوں کے کھڑا ہونے کو پسند کرتا ہو، جیسا کہ ترک اور عجمی لوگ کرتے ہیں۔

(۸): ہمارے علماء کے درمیان اس مسئلہ میں کچھ اختلاف ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے یا تلاوت کرنے والے شخص کے لیے کسی آنے والے کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے یا ناجائز۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ قاضی خان اور وغیرہ مسجد میں بھی کھڑا ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔

لیکن کنز العباد وغیرہ میں تعظیم وتکریم کے لیے مسجد میں کھڑا ہونے کو منع فرمایا ہے اور اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے:

((لا تعظِمونى فى بيتِ ربى))

یعنی میرے رب کے گھر میں میری تعظیم نہ کیا کریں۔ اس پر کلام کرتے ہوئے علامہ ابو مسعود نقل فرماتے ہیں: قال ولهذا اوصى السلف تلامذتهم ان لايقوموا لهم فِى المسجِدِ اِذا درسوا و قال فِيهِ اِشارة اِلى جوازِ ماتعورف فِى زمانِنا القِيام فِى غيرِ المسجِدِ عِند اِتمامِ الدرسِ..

۱؎ ردالمختار ص ۲۴۶ ج ۵ ومشکل الآثار ص ۳۹ ج ۲۔

www.darulemaan.com

...(فتح العین للعلامہ المسعود ص،۴۰۲ ج۳)

فرماتے ہیں کہ اس لیے ہمارے سلف اپنے شاگردوں کو وصیت فرماتے کہ ان کے لیے مسجد میں کھڑے نہ ہوں جس وقت وہ درس دیتے ہوں اور فرمایا کہ اس میں ہمارے زمانے کے متعارف قیام جو درس کے اختتام پر مسجد سے خارج ہوتا ہے کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس قیام کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے کہ کسی آنے والے کے لیے تعظیما کھڑا ہوا جائے یا نہ۔ اکثر اس کے جواز بلکہ استحباب کے قائل ہیں بشرطیکہ آنے والا شخص اہل فضیلت میں سے ہو اور تعظیم وتکریم کا مستحق ہو بلکہ بعض علماء کے اقوال سے متنازع فیہ قیام میں بھی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

جیسے ملا علی قاری رحم اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال الإمام حجۃالاسلام القیام مکروہ علی سبیلِ الاعظامِ لا علی سبیلِ الإکرامِ (المرقاۃ باب قیام ص۵۸۲ ج۴)

یعنی امام حجۃ الاسلام فرماتے ہیں کسی کے لیے بطور تعظیم کھڑا ہونا مکروہ ہے اور (صرف) اکرام کے لیے ہو تو مکروہ نہیں۔

اور فتح الباری میں اس بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں:

قال الغزالی القیام سبیلِ الإعظامِ مکروہ وعلی سبیلِ الإکرامِ لایکرہ وھذا تفصیل حسن (فتح الباری ص ۴۳ ج۱۱)

یعنی امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ قیام بطور تعظیم مکروہ ہے اور جو اکرام کی وجہ سے ہو تو مکروہ نہیں اور یہ اچھی تفصیل ہے۔

اب اگر اس سے مراد وہی ہو جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عجمیوں کے دستور کے مطابق

www.darleeman.com

کھڑا ہونا تو ممنوع ہے اور علماء و مشائخ کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے (جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے اس تفصیل سے گویا یہی مطلب سمجھا ہے۱) پھر تو جمہور علماء کے قول اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر اس قول سے مراد ان کا اسی قیام تعظیم و تکریم جو دینی شرف ہی کی وجہ سے کیا جاتا ہے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہو پھر تو تعظیم کے لیے کھڑا ہونا مکروہ اور اکرام کی خاطر جائز ہے۔ اسی طرح گویا متنازع فیہ قیام ہی میں تفصیل (یا فرق) مقصود ہوا اور ابن حجرؒ نے آخر میں ہذا تفصیل حسن فرما کر غالباً یہی فرق مراد لیا ہے کیونکہ بظاہر اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں۔ اور امام ابوداود نے سنن ابی داود میں جواز اور منع پر جو مختلف ابواب جس انداز سے وضع کیے ہیں اور اسی طرح بعض دوسرے حضرات کے اقوال سے اسی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ قیامِ تعظیمی کو مکروہ فرماتے ہیں اگرچہ عجم کا دستور نہ بھی ہو لیکن مسلمان بھائی کے اکرام کے لئے قیام کو جائز فرماتے ہیں بہرحال اگر اس تفصیل (فرق) کو تعظیمی قیام ہی مان لیا جائے تو شاید پھر اس کے جواز میں کسی کو بھی کلام نہ رہے کیونکہ مجلس سے فراغت کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا قیام اور انتظار فرمانا حتی کہ نبی کریم ﷺ گھر تشریف لے جاتے اس روایت کو ضرورت پر اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قیام کو محبت اور انصار کے ساتھ قیام کو حضرت معاذ کی مدد پر محمول کیا جائے (اگرچہ ان روایات میں قیام تعظیم کی کافی گنجائش ہے، تب بھی ان کو اکرام سے خالی ماننے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

---

۱ جیسا کہ حضرت ملا علی قاریؒ مذکورہ بالا قول کے تحت لکھتے ہیں کہ لعله اراد بالاکرام القیام التحیته لمزید المحبته وبالاعظام التمثیل له بالقیام وهو جالس علی اعاده الامرا الفخام(المرقاۃ ص۵۸۲ ج۴) یعنی شاید امام حجۃ الاسلام کی مراد قیام اکرام سے قیام تحیہ وسلام ہو جو کہ محبت کے بڑھانے کے لیے ہوا کرتا ہے جیسا کہ اس پر مصافہ دلالت اور قیام اعظام سے مراد ان کا وہ قیام ہو جس میں وہ امرا اور بڑے لوگوں کی عادت کے مطابق بیٹھنا ہوا ور لوگ اس کے لیے سیدھے (تعظیم) کے لئے کھڑے ہوں۔

۲۔ حیث قال اولا باب فی القیام الاحادیث التی تدل علی الجواز ثم ترجم بعد تسعة الابواب ، باب الرجل یقوم الرجل یعظمه بذالك(کتاب الادب ابو داود)۔

ان سارے واقعات میں اکرام واحترام کا تصور بھی موجود ہے۔ پھر محبت اور اکرام کے حکم میں بھی کوئی خاص فرق نہیں جیسے محبت اپنے محل وقوع میں جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی مسلمان بھائی کا اکرام اور مہمان کا اکرام (چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو) بھی ضروری ہے اور ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔

البتہ کسی غیر کی توقیر و تعظیم اگر چہ فی نفسہ جائز ہے لیکن پھر بھی اکرام اور تعظیم کے حکم میں فرق صاف طور پر واضح ہے۔ ہمیں بعض لوگوں کا اکرام کرنے کا تو حکم دیا گیا ہے لیکن تعظیم کی ممانعت ہے جیسے کافر مہمان وغیرہ کا اکرام جائز اور اس کی تعظیم ممنوع ہے۔

اور علامہ ابن عابدینؒ کسی آنے والے کے لیے ذبح کرنے کے حکم میں فرق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاِن قصدالتعظِیم لاتحِل.........وان قصد الاِکرامِ تحِل (ردالمختار ص۱۹۶ج۵)

یعنی اگر ذبح کرنے میں نیت اور قصد تعظیم کی ہے تو یہ مذبوحہ حلال نہیں اور اگر قصداً اکرام کی ہے تو حلال ہے۔

قیامِ اکرام اور قیامِ تعظیم میں فرق!

اب سوال یہ ہے کہ قیام تعظیم اور قیام اکرام میں فرق کیسے کیا جائے۔ اس فرق کو علماء کے اقوال سے کچھ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر آپ کے یہاں کوئی شخص آئے اور آپ اس کے لیے کھڑے ہوجائیں، آگے بڑھ کر مصافحہ وسلام کریں اور اپنی جگہ پر بٹھائیں یا پھر کسی کو رخصت کرتے وقت اس کے لیے کھڑا ہونا وغیرہ۔ یہ سب کچھ اکرام واحترام میں داخل ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی غیر آپ کی طرف نہ آرہا ہو، کسی دوسری طرف جارہا ہو یا ویسے ہی راستے سے گزر رہا ہو، اس کو دیکھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو جانا، یہ برتاؤ اکرام سے باہر اور داخل تعظیم ہے اسی طرح اور بھی قرائن ہو سکتے ہیں۔ جن کے ذریعے قیامِ اکرام اور قیامِ تعظیم میں تمیز کی جاسکتی ہے اسی فرق کے بارے میں علامہ ابن قیم کے

www.besturdubooks.net

قول سے بھی اشارہ مل سکتا ہے وہ فرماتے ہیں:

والقِیام ینقسِم اِلی ثلاثِ مراتِب قِیام علی راسِ الرجلِ وھوفعل الجبابِرِ وقِیام اِلیهِ عِندقدومه ولا باس بِهِ وقِیام له عِند رویته وھوالمتنازِع فِیهِ.(فتح الباری ص ٤٠ ج١١)

یعنی قیام کے تین مراتب ہیں (پہلا یہ کہ) کسی کے سر پر (یعنی اردگرد یا سامنے جب کہ وہ بیٹھا ہوا ہو) یہ تو جابر اور متکبر لوگوں کا فعل ہے (جو بالاتفاق ناجائز ہے) (دوسرا یہ کہ) کسی کے لیے کھڑے ہو جانا جب وہ آئے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور (تیسرا یہ کہ) اس کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جائے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

ایک دوسری جگہ ان (حافظ ابن قیم) سے منقول ہے:

اِن القِیام علی ثلثِةاقسام الاول اِن یکون رجل مقتدی یذھب لِحاجتِهِ اِلی جانِبِ آخر ولایاتی اِلی ھذا لرجلِ القائِمِ فھذا منھی عنه والثانِی ان یتِی مقتد اِلی ھذا لقائِم فقِیامه له جائز و قیل مستحِب اقول عِندی انه غیر مر ضِی اِذا بولغ فِیهِ والثالِث ان یکون المقتدی جالِس والناس قائِمین فھذاطرِیقِ الاعاجِمِ .(عرف الشذی علی حاشیة الترمذی:باب الادب)

یعنی قیام کی تین قسمیں ہیں اول یہ کہ مقتدی اور پیشوا آدمی کسی ضرورت سے کسی دوسری طرف جا رہا ہو اور قیام کرنے والے شخص کی طرف نہیں آتا ہو تو اس شخص کا قیام (اس مقتدی) کے لیے منع ہے دوسری قسم یہ کہ مقتدی (امام) آدمی اس کھڑے ہونے والے شخص کے پاس آ رہا ہو تو اس آدمی کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ مستحب ہے۔ (لیکن، میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ قیام بھی ناپسندیدہ ہے جب کہ اس میں مبالغہ کیا جائے۔) تیسری قسم (قیام کی) یہ ہے کہ مقتدی بیٹھا ہوا ہو اور لوگ (اس کے سامنے یا اردگرد) کھڑے ہوں یہی اعاجم کا دستور ہے۔

www.darulieman.com

ان عبارات میں غور کرنے سے اکرام کے قیام اور تعظیم کے قیام میں فرق واضح ہوسکتا ہے۔علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی آمد پر اس کے اکرام کے لیے کھڑا ہونا کسی کے نزدیک بھی ناجائز نہیں۔غور کا مقام ہے کہ علامہ ابن قیم متنازع فیہ قیام میں، قیام سے منع کرنے والے حضرات کے ساتھ ہیں۔لیکن پھر بھی اوپر بیان کردہ دوسری قسم کے قیام کو مکروہ اور ناجائز نہیں فرماتے۔جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ قیام جس میں اختلاف ہے، صرف وہی قیام تعظیم وتکریم ہے جو علمائے کرام اور مشائخ عظام کی عظمت وتعظیم کی وجہ سے کیا جائے۔واللہ اعلم۔بہرحال یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس قسم کے اختلاف کو چاہے کتنا ہی شدید طور پر متنازع فی کیوں نہ ہو، کفر وشرک کے برابر اختلاف بنالینا یا کفر شرک جیسا اختلاف ماننا اور عوام کو اس غلط نظریہ کا باور کرانا بہت بڑا ظلم ہے۔

چاہے کوئی قیام کو جائز سمجھتا ہو یا اس کا مخالف ہو، دونوں کے لیے ایک دوسرے پر بے جا الزامات لگانا کوئی دینی خدمت نہیں۔اسی طرح قیام تعظیم وتکریم کو جائز سمجھ کر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ رکوع اور سجدہ تعظیم بھی جائز ہیں۔یہ بھی ظلمِ عظیم ہے۔کیونکہ رکوع اور سجدہ تحیۃ کی حرمت صراحۃً ثابت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا:

اینحنِی بعضُنا بعضا [1] تو آپ ﷺ نے فرمایا:''لا''اور جب آپ ﷺ سے آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک ہی کے لیے سجدہ کرنے کے بارے میں عرض کیا گیا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔دوسری بات یہ ہے کہ اسکی حرمت پر اجماع۔تیسری بات یہ کہ قیام کی بعض قسمیں تو باجماع امت جائز اور ثابت ہیں۔لیکن سجدہ اور رکوع کی کوئی قسم بغرضِ رکوع اور سجود دین اسلام میں جائز نہیں، اور نہ صراحۃً ثابت ہے۔

---

[1] کیا ہم میں کوئی کسی دوسرے کے لیے جھکے؟ تو فرمایا کہ نہیں۔

www.darulfeman.com

www.daruleeman.com

باب چہارم توسل بالاعمال!

دعا اور توسل!

انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے یا کسی مرض اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔غرض جب اس کو کوئی ایسا مسئلہ پیش آتا ہے جس کا حل اسباب کے تحت اپنے ممکن وسائل اور ذرائع کی حدود میں اس کو نہیں ملتا، تو ایسی حالت میں وہ ایک ایسی ہستی سے اس مسئلہ کے حل اور اس حاجت برآری کے لیے سوال کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی پکار کو سن رہا ہے اور اس کی ہر مشکل اور حاجت کو جانتا اور دیکھتا ہے نیز وہ مشکلات ومصائب کو دور کرنے حاجات اور ضروریات کے پورا کرنے پر بھی قادر ہے اور کلی اختیار اس کو حاصل ہے۔

دین اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔وہ اسباب[1] و ذرائع سے بالاتر اختیار کا مالک ہے اور اس کا یہ اختیار و اقتدار اور قدرت ایسی بے

[1] اس سے مراد یہ ہے کہ اسباب کے تحت کسی سے مدد مانگنا وہ خاص استعانت (یعنی مدد طلب کرنا) اور دعائیں جو صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے۔بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مختلف قسم کے اسباب پیدا فرمائے ہیں، ان میں تاثیر رکھی ہے جیسے آگ سے گرمی کا حصول، پانی سے پیاس کا ختم یا کم ہونا یا جیسے مریضوں کی شفایابی کے لیے ادویات کا استعمال اور ماہرینِ طب کے ہاں جانا، حصولِ علم کے لیے صحبت استاد کا کارگر ہونا، اسی طرح ہر انسان دوسرے انسانوں سے مدد حاصل کرتا، تاجر کو گاہک کی ضرورت، غرض صنعت کار مزدور، حاکم و محکوم وغیرہ جو بھی ہوں ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں۔ ہر انسان مادی اسباب سے فائدہ اٹھانے اور دوسروں سے کام لینے کا محتاج ہوتا ہے ان سے مدد حاصل کرتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کا نظام چل رہا ہے اور یہ مدد مانگنا کسی بھی دین و شریعت میں ناجائز اور ممنوع نہیں بلکہ ناجائز و ممنوع وہ استعانت ہے جس میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو صاحب اختیار جان کر اس سے اسباب سے بالاتر کوئی چیز مانگی جائے۔

www.KitaboSunnat.com

نہایت ہے کہ اس کے ارادے کے بغیر کوئی پتا نہ ہل سکتا ہے اور نہ گر سکتا ہے وہ ہر جگہ ہر وقت تمام مخلوق کے حالات اور ضروریات کو پوری طرح جانتا ہے اور دیکھتا ہے۔ وہی قسمتوں کا بنانے والا ہے مشکلوں کو حل کرنے والا، حاجات کو پورا کرنے والا اور مصیبتوں کو دفع کرنے والا ہے۔ یہاں تک تو کفار ومشرکین بھی مانتے ہیں کہ قادر مطلق اور مختار کل سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں۔ البتہ مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی فرشتہ، نبی اور ولی یا کسی دوسری مخلوق کو کسی دائرہ میں کوئی اختیار وقدرت ایسی سپرد نہیں کی ہے جس کی وجہ سے وہ اس [1] دائرہ میں کسی کا کام خود مختاری سے پورا کر دے اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار دے رکھا ہے وہ کسی کی دعا قبول کرے یا اسے رد کرے، اس لیے ایک مسلمان صرف اللہ تعالیٰ سے ہی دعا مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرتا ہے:

﴿وقال ربکم ادعونی استجب لکم ط إن الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین﴾ (المؤمن آیت ۶۰)

''اور تمہارے پروردگار نے فرمایا مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کر کے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

دعا عبادت ہے!

اگر چہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ تم میری عبادت کرو، میں تمہیں ثواب دوں گا۔ اور بعض وہ مفہوم لیا ہے جو اوپر ترجمہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں تفسیریں ہم معنی ہیں

[1] مشرکین عرب اگر چہ یہ کہتے تھے کہ قادر مطلق اور کامل اختیارات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت واختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کے سپرد کیا ہے اور وہ شخص اسی دائرہ میں خود مختار ہے اس لیے وہ بتوں و دیوتاں کو پکارتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے جیسا کہ پچھلے صفحات میں یہ مفصل گزر چکا ہے۔

www.darueeman.com

ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ عبادت اور دعا اگرچہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں مگر مصداق کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفاوت نہیں۔اس لئے یہاں پہلے فقرے میں جس چیز کو دعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نام ہے کسی کے سامنے انتہا درجہ کی عاجزی اور تذلل اختیار کرنے کا۔اور یہ ظاہر ہے کہ جب بندہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرکے اوراس سے دعا مانگتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اوراس آقائی کا اعتراف اوراپنی بندگی وعاجزی کا اقرار کرتا ہے،تو یہ اظہارِ بندگی بجائے خود عبادت بلکہ روحِ عبادت ہے اوراس پر (کہ دعا عبادت ہی ہے) رحمۃ للعالمین خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے صریح ارشادات موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِن الـدعا هو العِبادة ثم قرأ ﴿وربكم ادعو نِي استجِب لكم اِن الذِين يستكبِرون عن عِبادتِي سيدخلون جهنم داخِرين﴾))

یعنی دعا عبادت ہے پھر (آپ ﷺ نے اس کے استدلال میں) یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وقـال ربـكـم ادعـونـيّ استجِب لكم اِن الذِين يستكبِرون عن عِبادتِي سيدخلون جهنم داخِرين .﴾ ۱؎

اور سنن الترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

الدعاء مخ العِبادة یعنی دعا عبادت کا مغز ہے (سنن الترمذی ابواب الدعوات ج ۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

۱؎ الترمذی ابواب الدعوات ج ۲ اسی حدیث شریف کو مسند احمد، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے امام ترمذیؒ اس حدیث کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ ہذا حدیث حسن صحیح۔

www.darulemaan.com

((لیس شی اکرم علی اللہِ مِن الدعاءِ))اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز مکرم نہیں۔(سنن الترمذی ابواب الدعوات ج ۲)

حضرت ابوسعید خدری ؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

مامِن مسلِم یدعو ا بِدعوۃ لیس فِیھا اِ ثم ولا قطعیۃ رحم اِلا اعطاہ اللہ بِھااِحدی ثلث اِما ان یعجل لہ دعوتہ واِما ان ید خِرھا لہ فِی الآخِرۃِ واِما ان یصرِف مِن السوء مِثلِھا قالوا اِذ نکثِر قال۔ اللہ ا کثر(رواہ احمد کذافی المشکوٰۃ کتاب الدعوات)

یعنی ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے یا تو جو مانگا ہے وہی دنیا میں عطا کرتا ہے یا اس دعا کو آخرت میں اجر وثواب دینے کے لیے محفوظ کر دیتا ہے یا (اس کو وہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر) اسی درجے کی آفت اور مصیبت جو اس پر آنے والی تھی اس پر آنے سے روک لیتا ہے۔صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا پھر تو ہم کثرت سے دعا مانگا کریں گے (اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا) اللہ تعالیٰ کا فضل وعطا بہت زیادہ ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ سے مانگنے پر دنیا وآخرت کا اجر وثواب ملتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی اپنے آپ کو مستغنی سمجھے اور تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں پر عتاب فرمایا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ کے دوسرے فقرے میں ارشاد ہے:

﴿اِن الذِین یستکبِرون عن عِبادتِی سیدخلون جھنم داخِرِین﴾

یعنی بے شک جو لوگ میری عبادت سے (یعنی دعا اور عبادت سے بوجہ استغنا اور تکبر) منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اور حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

www.darulfeeman.com

من لم یسال اللہ یغضب علیہ(الترمذی ابواب الدعوات ج۲)

یعنی ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے (اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر بوجہ تکبر کے) اپنی حاجت کا سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوتا ہے۔''

غرض دعا عبادت بلکہ مغز اور روحِ عبادت ہے۔اس لیے جس طرح دوسری عبادات صوم، صلوۃ، نذر و نیاز وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کیے جاتے ہیں۔اسی طرح دعا بھی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اسی سے مانگی جاتی ہے۔

لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو صاحبِ اختیار جان کر اس سے اسباب سے بالاتر کسی چیز کا سوال کرتا ہے وہ صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ جب دعا کی حقیقت اور اس کی حیثیت سے واقفیت ہوئی تو مناسب یہ ہے کہ کسی عمل یا کسی مقبول بندہ پر دعا میں توسل کرنے کی حقیقت اور حیثیت کو بھی واضح کر دیا جائے تا کہ جائز و ناجائز توسل میں فرق و امتیاز کھُل کر سامنے آجائے۔

دعا میں توسل کی اقسام!

دعا میں توسل کی کئی قسمیں ہیں بعض ان میں بالاتفاق جائز ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے اسما اور صفات کے وسیلہ اور ذریعہ سے یا حمد و ثنا درود شریف پڑھ کر دعا مانگنا وغیرہ اور بعض اقسام بالاتفاق ناجائز مثلاً کسی مخلوق سے براہ راست کوئی ایسی چیز مانگنا جو اسباب سے بالاتر ہو۔مثلاً کسی انسان یا فرشتہ سے یا جن کو صاحبِ اختیار جان کر ان سے اولاد وغیرہ مانگنا۔

استشفاع!

توسل کی ایک قسم استشفاع ہے جس میں کسی مخلوق سے براہ راست تو اپنی حاجات نہیں مانگی جاتیں، البتہ ان کی خدمت میں گزارش کی جائے کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کے دربار میں ہماری حاجت اور مراد پوری ہونے کی دعا فرمائیں اس کا حکم یہ ہے کہ جو حضرات دنیا میں تشریف فرما ہیں ان سے دعا کی

www.darulfaiman.com

درخواست کرنا بالاجماع جائز بلکہ مستحب ہے۔ البتہ وہ نیک وصالح جو اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کی قبور پر جا کر ان سے دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اس میں ہمارے علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو ناجائز اور بدعت کہتے ہیں۔ جو حضرات توسل کی اس قسم کو بدعت اور ناجائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح توسل کے اختیار کرنے سے شرک میں پڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ نیک وصالح شخص سے اگر ان کی حیات میں دعا مانگی جائے تو یہ آپ کے نزدیک بھی جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے تو پھر اس کے مرنے کے بعد (اگرچہ آپ مردوں کے سننے کے قائل بھی ہیں) اس سے دعا کی درخواست کرنا بدعت اور ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں؟ حافظ ابن تیمیہ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ یا کسی صالح شخص سے سوال کرنے میں اور وفات کے بعد یا غائب ہونے کی صورت میں ان سے سوال کرنے میں فرق یہ ہے کہ زندگی میں تو کوئی ان کی پرستش نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انبیا وصالحین اپنی زندگی کے اندر اپنے حضور میں کسی کا مشرکانہ حرکت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ روکتے تھے اور اس پر سزا دیتے تھے، اس پر حضرت حافظ نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا قول اس پر شاہد ہے:

﴿ ما قلت لهم الا مآ امرتني به ان اعبدالله ربي وربكم ج وكنت عليهم شهيدا ما دمت فيهم فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم وانت على كل شئى شهيد ﴾ (مائدہ:۱۱۷)

یعنی" تو نے جو مجھے حکم دیا تھا بس وہی میں نے انہیں کہہ سنایا تھا کہ اللہ جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اسی کی عبادت کرو اور جب تک میں ان میں موجود رہا ان کا نگران حال رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا تو تُو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہے۔"

www.urduweb.com

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے یوں کہا: ماشآء الله وشِئت. تو آپ ﷺ نے فرمایا اجعلتنی لِلهِ نِدا. ماشاء الله وحده. کیا تو نے اللہ کا شریک بنا دیا بس یوں کہو ''اللہ وحدہ جو چاہے۔'' اور اس کو نصیحت کر کے فرمایا کہ ماشآء محمد مت کہا کرو بلکہ یوں کہہ دیا کرو ماشآء الله ثم شآء محمد۔ جو اللہ کی مرضی اور اس کے بعد محمد (رسول اللہ ﷺ) کی مرضی۔

اسی طرح ایک شادی کے موقع پر انصار کی بچیاں اپنے ان آباء واجداد کی شجاعت بیان کرتی تھیں جو بدر کے دن شہید ہو گئے تھے، تو ان میں سے ایک بچی نے جب یہ کہا: وفینا رسول اللهِ یعلم مافِی غد۔ ہم میں اللہ کے رسول موجود ہیں جو آئندہ کل کی بات جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((دعِی هذِه وقولِی بِالذِی کنتِ تقولِین))

''ایسا مت کہہ اور جو تو پہلے کہتی تھی وہی کہہ''

اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم (نماز میں) صف بستہ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے (اور آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے) تو فرمایا:

لاتعظِمونِی کما تعظِم الاعاجِم بعضهم بعضا۔

''اسی طرح میری عزت و تعظیم نہ کرو جیسے عجمی لوگ ایک دوسرے کی کیا کرتے ہیں۔''

اسی طرح جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا اور کہا:

((انه لا یصلِح السجود الا للهِ ولو کنت آمرا احدا ان یسجد لِاحدلامرت المرأة ان تسجدلِزوجها مِن عظمِ حقِه علیها))

یعنی ''سجدہ فقط اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اگر میں کسی شخص کو کسی شخص کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے کیونکہ شوہر کا بیوی پر بہت بڑا حق ہے۔''

www.darulemaan.com

اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں زنادقہ کا وہ گروہ [1] پیش ہوا جو ان کی خدائی کا قائل تھا تو آپ نے ان کے جلا دینے کا حکم دیا۔

[1] ملحوظ رہے کہ یہ زنادقہ کا وہ گروہ تھا جو عبداللہ ابن سبا کے پیروکار تھے اپنے کو شیعان علی باور کراتے تھے حالانکہ ان کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کوئی تعلق نہ تھا عبداللہ ابن سبا یمن کا یہودی عالم تھا اس منافق نے اسی ارادے اور منصوبے کے تحت یہودیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا جس کے تحت سینٹ پال (پولس) نے یہودیت چھوڑ کے عیسایت قبول کی تھی اور حضرت عیسی علیہ السلام کے دین کو مسخ کر ڈالا تھا، ابن سبا نے بھی وہی کچھ کرانا چاہا جو سینٹ پال نے کیا تھا۔ چنانچہ اس نے حضرت علی رضی اللہ کے ساتھ غیر معمولی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شان میں طرح طرح کی غلو باتیں کرنا شروع کیں ان کی طرف عجیب عجیب معجزے منسوب کر کے ان کو ایک مافوق البشر ہستی باور کرانے کی کوشش کی۔ بعض کم فہم نومسلموں کو یہ باور کرایا کہ اللہ نے نبوت ورسالت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن طالب کو منتخب کیا تھا لیکن جبریلؑ کو اشتباہ ہو گیا اور غلطی سے وحی محمد بن عبداللہ کے پاس لے گئے یہاں تک کہ اس منافق نے کچھ سادہ لوحوں کو وہی سبق پڑھایا جو سینٹ پال (پولس) نے عیسایوں کو پڑھایا تھا اور ان کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس دنیا میں خدا کا روپ دھار کر آئے ہیں اور گویا وہی خدا ہیں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی طرح یہ بات پہنچ گئی کہ ان کے لشکر کے کچھ لوگ ان کے بارے اسی طرح کی باتیں چلا رہے ہیں تو آپ نے ان زندیقوں کو قتل کرا دینے اور لوگوں کو عبرت کے لیے آگ میں ڈلوا دینے کا حکم فرمایا لیکن اس وقت خاص حالات میں اس کاروائی کو دوسرے مناسب وقت کے لیے ملتوی کر دیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رکھنے والے اس کی دعوت دینے والے زنادقہ انہی کے حکم سے قتل کیے گئے اور آگ میں ڈال دئے گئے لیکن پھر بھی ان میں سے بہت سے شیاطین اور خود عبداللہ ابن سبا سرغنہ شیاطین بچ نکلے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے یہ کہنے لگا کہ مقتول حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں بلکہ شیطان ہے جس نے لوگوں کے سامنے حضرت علی کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

www.darulmaarif.com

امام ابن تیمہ اسی طرح مثالیں پیش کر کے آگے فرماتے ہیں کہ انبیاء اور صالحین کی شان میں غلو کرنا، ان کو رب بنالینا اور ان کے ساتھ شرک کرنا یہ اس قسم کی باتیں ہیں جو ان کی غیبو بت میں یا ان کی وفات کے بعد حاصل ہوتی ہیں چنانچہ مسیح اور عزیر علیہما السلام کے ساتھ ان کی غیبت اور وفات کے بعد شرک کیا گیا۔ پس یہی راز ہے جس سے نبی کریم ﷺ اور کسی صالح ولی ءاللہ کی زندگی میں ان کے روبرو ان سیسوال اور ان کی وفات کے بعد یا غیر حاضری میں ان سے درخواست کرنے میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں بلکہ تمام سلف وصالحین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو انبیاء کی قبور کے پاس نماز پڑھنے کو اختیار و پسند کرتا ہو یا مزارات کے پاس دعا کی ہو، اور نہ کبھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی طرح آسمان پر اٹھالیا گیا ہے جس حضرت عیسی علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اٹھالیا گیا تھا۔ وہ اور اس کے پیروکار اسی طرح مکروفریب کر کے لوگوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔ چونکہ ان کی یہ دعوت تحریک خفیہ طور پر اور سرگوشیوں کے ذریعے جاری تھی اس لیے اس سے متاثر ہونے والے ایک ہی خیال اور عقیدہ کے نہیں تھے اس کے داعی جس کو جو بات اور جتنی بات مناسب سمجھتے تھے وہی کہتے اگر وہ اس کو قبول کر لیتا تو وہی اس کا عقیدہ بن جاتا، اسی طرح ان کے مختلف فرقے بنتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد ستر سے متجاوز ہوگئی۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ جس طرح پولس یہودی نے حضرت عیسی علیہ السلام کے دین کو مسخ کر دیا تھا اسی طرح یہودی سازش اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کامیابی کا خواب دیکھتے تھے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وتابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی شدت سے اس فتنے کی سرکوبی کی جس کی وجہ سے سبائی گروہ (رافضی شیعہ) اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے عقائد ونظریات کو عقیدہ تقیہ نقاب میں چھپائے لیکن عصرِ حاضر میں تو اس من گھڑت عقیدہ تقیہ کے نقاب کو ایسا چاک کر دیا گیا کہ ان کا اصلی چہرہ منظرِ عام پر آ گیا۔ ان کے خرافات وکفریات کی قلعی ایسی کھل گئی کہ عوام سادہ لوح مسلمان بھی اب ان کی کفریات اور خرافات سے بے خبر نہیں ہیں۔

www.maktabah.org

غائبانہ ان سے سوال اور استغاثہ (فریادخواہی) کرتے تھے نہ قبروں کے پاس، علیٰ ہذا القیاس اعتکاف اور مجاور ہو کر بیٹھنے کا ان سے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں قائلین حضرات فرماتے ہیں کہ بہت سے سلف صالحین فقہاء بلکہ بعض صحابہ کرام ﷺ سے بھی یہ بات منقول ہے کہ وہ حضور ﷺ کی قبر شریف پر حاضر ہو کر صلوۃ وسلام پڑھنے کے بعد ان سے بارگاہ الٰہی میں مغفرت اور سفارش کرانے کی درخواست کرتے تھے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے روضہ اطہر پر حاضری کے وقت صلوۃ وسلام آنحضرت ﷺ کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں مغفرت اور شفاعت وغیرہ کی درخواست کرنے والی دعائیں اور ان دعاؤں کی تعلیم مناسک حج وغیرہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس لیے ایسا شخص جو قبر شریف پر حاضر ہو جائے اگر وہ حضور ﷺ کی خدمت میں دعا اور شفاعت کی درخواست کرے تو یہ جمہور علماء کے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے۔ البتہ حافظ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال علماء اس کو خلاف سنت اور بدعت کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جمہور علماء اس بات کو بھی جائز کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کی قبر پر حاضر ہو کر یہ درخواست کرنا کہ وہ قبر والا اللہ کی بارگاہ میں ہماری حاجت پوری ہونے کی دعا کرے اس کے جواب میں یوں کہا جاتا ہے کہ جو صحابہ کرام ﷺ اور متقدمین علماء اس بات کے قائل نہیں کہ مُردے اپنے زیارت کرنے والے کے سلام کلام کو سنتے ہیں، ان کے نزدیک تو مردوں کو خطاب کرنا بھی درست نہیں، اس لیے ان میں سے تو کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح توسل کا قائل ہو سکے اور نہ ان حضرات کا یہ معمول ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میت سے دعا کی درخواست کرتے اور سماعِ موتی کے بارے میں جن حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ قبر کے نزدیک مردے ہماری باتوں کو سنتے ہیں۔

تو ان میں سے بھی کسی صحابی یا متقدمین علماء میں سے کسی سے ثابت نہیں کہ اس نے کسی صالح یا شہید کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کی ہو اس لیے حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد اور علامہ

www.darulfeeman.com

آلوسی اور دیگر متعدد علمائے کرامؒ اگر چہ اس بات کے قائل ہیں کہ مردے فی الجملہ سنتے اور جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس طرح دعا کی درخواست کرنے پر عدم جواز کا فتوے دیتے ہیں اوران کے نزدیک توسل کرنا بدعت اور ناجائز ہیں۔البتہ بعض متاخرین علماء غیرانبیاء علیہم السلام کی قبور پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کرنے کو بھی جائز بتاتے ہیں۔

لیکن پھر بھی انبیا علیہم السلام کے علاوہ کسی نیک صالح یا شہید کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کرنا زیادہ مشتبہ چیز معلوم ہوتی ہے۔اس لیے غیر انبیاء علیہم السلام میں مانعین کے قول پر عمل کرنا احوط اوراسلم ہے واللہ اعلم۔

توسل کی اقسام میں سے ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں نزاع تو ضرور ہے لیکن یہ ایسی نزاع نہیں جس کی بنیاد پر کسی ایک فریق کو (خواہ قائلین میں سے ہو یا منکرین میں سے) مشرک، بدعتی یا گمراہ کہا جائے اور یہاں صرف توسل کی قسم پر قدرے تفصیل سے بحث کرنی مقصود ہے تا کہ اس بے خطر توسل میں اختلاف کو دیکھ کر توسل کی دوسری اقسام کی حیثیت بھی واضح ہو جائے۔اس قسم کے توسل کے ساتھ توسل بالاعمال کی کچھ تشریح اس لیے پیش کی جاتی ہے تا کہ کسی شخصیت پر توسل کرنے کی حقیقت معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

توسل بالاعمال!

اپنے نیک اعمال چاہے ظاہری ہوں یا باطنی، کی وساطت (ذریعہ) سے اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے، سوال کیا جائے توسل کی اس قسم پر قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ اور احادیث شریفہ شاہد ہیں۔جس میں سے صرف ایک آیت کریمہ اور ایک ہی حدیث پر اکتفا کرتا ہوں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِگرامی ہے:﴿ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا صلے ق ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفّر عنا سیا تنا وتوفنا مع الابرار﴾(آلِ عمران:۱۹۲)

www.darulemaan.com

یعنی "اے ہمارے رب! ہم نے اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے (رسول ﷺ) کے اس اعلان کو سنا کہ (اے لوگو!) تم اپنے رب کی ذات، صفات پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے اور ہماری برائیاں دور کر دیجئے اور ہم کو نیک لوگوں کے زمرہ (میں شامل) فرما کر موت دیجئے۔"

اور ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ تین میں آدمی کہیں جا رہے تھے، بارش نے انہیں گھیر لیا۔ وہ بارش سے بچنے کے لئے ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑ کا ایک پتھر غار کے منہ پر آ گرا اور باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ اب انہوں نے کہا کہ جو اعمال ہم نے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کئے ہیں، ان کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہیے۔ شاید اللہ پاک اس پتھر کو دور کر دے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا اے اللہ میری ماں باپ بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ میں بکریاں چراتا تھا۔ جب شام کے وقت میں واپس آتا اور دودھ دھوتا تو سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو پلاتا۔ ایک دن میں بکریوں کو چرانے کے لئے بہت دور لے گیا اور رات دیر سے لوٹا۔ میرے والدین سو چکے تھے۔ میں نے حسبِ معمول دودھ دوہا اور ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور یہ بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اپنے بچوں کو ان سے پہلے دودھ پلا دوں۔ بچے بھوک کے مارے چلاتے رہے میرا اور ان کا یہی حال رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ تب والدین جاگے اور انہوں نے پہلے پی لیا پس اے اللہ اگر میں نے یہ کام خالص تیری رضا کے لیے کیا ہو تو اس پتھر کو اتنا ہٹا دے کہ ہمیں آسمان نظر آ جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے پتھر کو اتنا ہٹا دیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔ دوسرے نے عرض کی اے اللہ میرے چچا کی ایک بیٹی تھی مجھ کو اس کے ساتھ ایسی شدید محبت تھی جس قدر کہ آدمی کو عورت سے ہو سکتی ہے۔ میں نے اس سے اس کے نفس کا مطالبہ کیا اس نے انکار کیا۔ یہاں تک ایک سال اسے قحط سے سخت تکلیف پہنچی اور وہ میرے پاس (مجبوراً) آئی میں نے اسے ایک سو بیس دینار اس شرط پر دیئے کہ وہ میری خواہشِ نفس کو پورا کرے جب میں نے اس پر قابو پا لیا تو وہ کہنے لگی اے اللہ کے بندے!

www.gareeb.com

اللہ سے ڈر اور مہر کو ناحق نہ توڑ! پس میں اس سے فوراً اٹھا (اور اس سے اپنا سونا اور دینار بھی واپس نہ لیا) اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام خاص تیری رضا مندی کے لیے کیا ہو تو ہماری مصیبت کو دور کر دے پس اللہ تعالیٰ نے غار کے منہ کو تھوڑا اور کھول دیا۔

تیسرا شخص کہنے لگا کہ میں نے کچھ مزدور کام پر لگائے جب انہوں نے کام ختم کر دیا تو میں نے سب کو مزدوری دے دی سوائے ایک آدمی کے جس نے (خفا ہوکر) اپنا حق چھوڑ دیا اور چلا گیا میں اس کے حق میں زراعت کرنے لگا یہاں تک کہ بہت سا مال و مویشی جمع ہو گئے کافی مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا اللہ سے ڈر، مجھے میری مزدوری دیدے۔ میں نے اس سے کہا یہ سب اونٹ گائے، بیل، بکریاں اور چرواہے لے جاؤ کہنے لگا اے اللہ کے بندے میرے ساتھ مذاق نہ کرو۔ میں نے جواب دیا کہ میں تیرے ساتھ مذاق نہیں کرتا۔ پس وہ ان سب کو لے کر چلا گیا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ کام خالصتہً تیرے لیے کیا ہو تو ہماری تکلیف کو دور کر دے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پتھر کو دور کر دیا اور وہ باہر نکل کر چلے گئے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ باب البر والصلہ)

تینوں حضرات نے اپنے اپنے نیک عمل کے ذریعے سے دعا کی اسی کو توسل بالاعمال کہتے ہیں۔ اس قسم کا وسیلہ اختیار کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بالاجماع جائز اور مستحسن ہے۔

کسی شخصیت پر توسل!

اللہ تبارک وتعالی سے انبیاء علیہم السلام اور صالحین یعنی نیک بندوں کے ذریعے وسیلے یا واسطے سے دعا کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر متقدمین (پہلے زمانے کے) علماء اور فقہائے کرام میں سے کسی نے خاص بحث نہیں کی اور نہ ہی اس کو صراحتہً منع فرمایا ہے۔

البتہ اس میں حضرت حافظ ابن تیمیہ وغیرہ نے اختلاف کیا ہے وہ اپنے رسالہ قاعدہ جلیلہ میں لکھتے ہیں کہ:

و لفظ(التوسلِ)قدیرادبہ ثلاثۃ امور یرادبہٖ امرا نِ متفق علیھما بین المسلِمین احدھما ھو اصل الاِیمانِ والاِسلامِ وھو التوسل باِالاِیمانِ بہ(ای باِ لرسولِ صلی اللہِ علیہ وسلم)و بِطاعتِہ، والثانِی دعاؤہ وشفاعتہ وھذا ایضاًنا فع......(قاعدہ جلیلہ ص ۱٤)

یعنی ''توسل کے تین معنی لئے جاتے ہیں دو معنی تو تمام مسلمانوں کے ہاں بالاتفاق جائز ہیں۔ان میں سے ایک تو اصل ایمان واسلام ہے وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان اوران کی اطاعت کے ذریعہ سے(توسل کیا جائے)یعنی آپ ﷺ کی اطاعت کی جائے دوسرا یہ کہ آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کا وسیلہ پکڑنا(یعنی توسل کرنا)اور یہ بھی نفع پہنچاتا ہے۔''

اس کے بعد حضرت حافظ فرماتے ہیں کہ جوکوئی بھی ان دونوں معانی میں سے کسی ایک کا انکار کردے وہ کافر اور مرتد ہے اگر توبہ نہ کرے تو مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دوسری قسم کے توسل سے انکار پہلی قسم کے انکار سے ہلکا کفر ہے۔

چند صفحات چھوڑ کر آگے لکھتے ہیں:

فلفظ التوسلِ یراد بہ ثلاثۃ معان احدھاالتوسل بطاعتِہ فھذا فرض لا یتِم الاِیمان اِلا بہ والثانِی التوسل بِدعائِہ وشفا عتِہ وھذا کان فِی حیاتِہ ویکون یوم القِیامۃِیتوسلون بِشفاعتِہ والثالِث التوسل بِمعنی الاِقسامِ علی اللہِ بِذاتِہ والسوال بِذاتِہ فھذا ھوالذِی لم تکنِ الصحابۃ یفعلونہ فی الاستِسقاءِ و نحوِہ لا فِی حیاتِہ ولا بعد مماتِہ لا عِند قبرِہ ولا غیرہ قبرِہ ولا یعرف ھذا فی شی مِن الادعِیۃِ المشھورۃِ بینھم واِنما ینقل شی مِن ذلِك فِی احادِیثِ ضعیفۃ مرفوعۃ وموقوفۃ او عن من لیس قولہ حجۃ(قاعدہ جلیلہ ص ٥٠)

یعنی ''توسل سے تین معنی مراد لیے جاتے ہیں اول آپ ﷺ کی اطاعت کا وسیلہ یہ تو فرض ہے بغیر اس کے ایمان مکمل نہیں ہوتا دوسرے آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کا ذریعہ(وسیلہ)یہ آپ ﷺ کی زندگی

میں تھا اور پھر قیامت کے دن سب لوگ آپ ﷺ کی شفاعت کا ذریعہ ڈھونڈیں گے۔ تیسری قسم توسل کی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کی قسم دی جائے یا ان کی ذات مبارک کو ذریعہ بنا کر سوال کیا جائے یہ وہ توسل ہے جس کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کبھی نہیں اختیار کیا، نہ استسقاء (بارش وغیرہ) کے لیے نہ کسی اور کام کے لیے نہ حضور ﷺ کی زندگی میں، نہ ان کی رحلت کے بعد، نہ ان کی قبر مبارک کے پاس، نہ ان کی قبر کے علاوہ کسی دوسری جگہ۔ اور نہ اس قسم کا توسل مشہور دعاؤں میں پایا جاتا ہے بلکہ (اس قسم کے توسل کی تائید میں) ضعیف مرفوع اور موقوف احادیث پیش کی جاتی ہیں یا ایسے لوگوں کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں جن کا قول حجت اور دلیل نہیں۔''

اور اسی رسالہ ص ۱۰۶ میں لکھتے ہیں:

واما السوال به مِن غيرِ اِقسام به فهذا ايضا مِما منع غير واحِد مِن العلماِء والسننِ الصحِيحةِ عنِ النبی صلی الله عليهِ وسلم وخلفائِه الراشِدِين تدل علی ذلِك۔

یعنی'' آپ ﷺ کی ذات مبارکہ کے ذریعے سے سوال کرنا (اس طور پر) کہ آپ پر قسم نہ بھی دلائی جائے اس کو بھی متعدد علماء نے منع فرمایا ہے اور نبی کریم ﷺ کی صحیح سنتیں اور خلفاء راشدین کا عمل اس کے منع پر دلالت کرتا ہے۔''

اس طرح حضرت حافظؒ نے جابجا اس قسم کی عبارات لکھی ہیں اور ان میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بہت سے علماء نے اس توسل سے منع فرمایا ہے اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ توسل کی یہ قسم آپ ﷺ اور اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد مبارک میں نہیں تھی۔

پہلے دعویٰ کی حمایت میں انہوں نے وہ حدیثیں نقل کی ہیں جو غیر اللہ پر قسم کھانے کی ممانعت میں آئی ہیں یا وہ اقوال جو اللہ کو کسی (غیر اللہ) مخلوق کی قسم دینے کے بارے میں ہیں۔ وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں فقہاء احناف کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ:

www.darulemaan.com

ویکرہ ان یقول فی دعائِہ بِحقِ فلان وبِحقِ انبیائِك ورسلِك لِانہ لا حق لِلمخلوقِ.
(الہدایہ ج۴ ص۴۷۵)

یعنی دعا میں یہ کہنا کہ اے اللہ فلاں آدمی کے حق کے ذریعے یا تیرے نبیوں اور رسولوں علیہم السلام کا حق جو تجھ پر ہے اس کے وسیلہ سے میرا یہ کام کردے) یا میری یہ دعا قبول کرلے۔

یہ کہنا مکروہ ہے کیونکہ (اللہ تعالیٰ پر) مخلوق کا کوئی حق (واجب) نہیں البتہ (جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنی رحمت سے بغیر کسی وجوب کے خاص کردے یا اپنے فضل وکرم سے اپنے بندوں کے لیے کسی چیز کا وعدہ کرلے تو یہ دوسری بات ہے) کم وبیش اسی طرح کے الفاظ میں یہی مسئلہ خلاصۃ الفتاوی جلد صفحہ بحرلرائق جلد صفحہ اور الدر المختار جلد صفحہ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

چار جدا مسئلے!

درحقیقت یہاں چار الگ الگ مسائل ہیں۔

(۱): اول تو یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم کھانا مثلاً یوں کہنا کہ فلاں (انسان) کی قسم یا کعبہ کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ بالاتفاق ناجائز اور روحِ توحید کے خلاف ہے۔

(۲): دوسرا مسئلہ یہ کہ کسی مخلوق (یعنی اللہ کے سوا کسی اور) کی قسم اللہ تعالیٰ کو دی جائے اس کو بعض علماء نے جائز لکھا ہے اور ثبوت میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

رب اشعث مدفوع بِالابوابِ لواقسم علی اللہِ لابرہ۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ)

بہت سے پراگندہ بال والے (پریشان حال) دروازوں سے دھکیلے ہوئے ایسے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھالیویں تو اللہ تعالیٰ ان کو قسم میں سچا کردے۔

لیکن یہ حدیث ان کے لیے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی

ذات کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ کو قسم دی جائے تو اللہ تعالیٰ اس قسم دینے والے کے سوال کو پورا کردے گا۔ بلکہ یہاں تو خود انہیں کی شخصیت کا حال بیان کیا جارہا ہے کہ اگر وہ خود اللہ پر قسم کھالیویں کہ اللہ کی قسم اللہ ضرور ایسا کریگا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سچا کردے گا۔

(۳): تیسرا مسئلہ یہ کہ کسی کے حق کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا، مثلاً یہ کہنا کہ اے اللہ فلاں کا جو حق تجھ پر ہے اس کے وسیلہ سے میرا فلاں کام کردے، اسکو بھی ہمارے علماء نے ناجائز لکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی چیز ضروری، لازم یا واجب نہیں۔

البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو خاص کردے یا کسی کے لیے کسی شئی یا ثواب کا وعدہ فرمائے تو یہ ایسا حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف سے مقرر کررکھا ہے، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق اصلاً ثابت ہے لیکن بعض علماء اس کو جائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بعض دعاؤں میں اس طرح کے الفاظ موجود ہیں (آئندہ ان شاء اللہ اس کی مثالیں آئیں گی) اب جو لوگ ایسے الفاظ سے دعا کرنے کو جائز فرماتے ہیں وہ ان الفاظ کو حقیقی معنی میں نہیں لیتے بلکہ اس سے برکت، ثواب جس کا اللہ نے ازخود وعدہ کیا ہے حرمت وغیرہ مراد لیتے ہیں لیکن چونکہ ظاہری الفاظ سے حقیقی معنی بھی ذہن اور فہم میں آجاتے ہیں اس لیے یہاں پر بھی منع کو بہتر سمجھا جاتا ہے اور اس کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(۴): چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ کسی نیک شخص کے طفیل یا برکت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے مثلاً اے اللہ رسول اللہ ﷺ کے طفیل یا برکت سے میرا فلاں کام کردے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر متقدمین (پہلے زمانے کے) فقہاء نے کوئی خاص بحث نہیں کی ہے اور جو حضرات اس کو منع فرماتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے یہ (توسل) آئمہ متبوعین (یعنی وہ بڑے امام علماء جن کی امت مسلمہ نے پیروی کی ہے) کے ہاں نہیں تھا اور اپنے قول کی تائید میں مذکورہ بالا حنفی فقہاء اور دیگر علماء کرام کے اقوال نقل کرتے ہیں اس کے برعکس وہ حضرات جو اس قسم کے توسل کے قائل ہیں وہ مخالفین کی تردید کرتے

www.urdukitabkhanapdf / www.darulemaan.com

ہوئے فرماتے ہیں کہ متقدمین میں سے کسی نے بھی اس کو منع نہیں فرمایا اور اس بات کی تائید بھی بعض فقہاء سے ظاہر ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ یہی توسل متقدمین فقہاء کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے جیسا کہ حنابلہ کی کتابوں میں ہے:

ویجوز التوسل بصالح وقیل یستحب قال احمد فی منسکہ الذی کتبہ للمروزی انہ یتوسل بالنبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم فی دعائہ وجزم بہ فی المستوعب وغیرہ ....
(الفروع ج ۱ ص ۵۹۵ وکذافی الکشاف القناع)

یعنی نیک شخص کے ذریعے توسل جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ مستحب ہے (حضرت امام) احمدؒ مناسکِ حج میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے توسل کیا کریں اور کتب حنابلہ المستوعب وغیرہ میں اس پر تاکید کی گئی ہے۔ اس پر یقین کیا گیا ہے۔

اکثر حنبلی فقہاء نے اس قول سے اختلافی توسل ہی مراد لیا ہے البتہ آج کل کے اکثر علمائے حنابلہ کا وہی نظریہ ہے جو حافظ ابن تیمیہ کا ہے۔ اور وہ امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کی تاویل کرتے ہیں جیسا کہ حامد فقی نے کشاف القناع پر تعلیق کر کے لکھا ہے:

یرید الامام رضی اللہ تعالیٰ عنہ التوسل بطاعتہ واتباع ھدیہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم لا التوسل بجاھہ۔

یعنی امام احمدؒ کی مراد یہاں رسول اللہ کے اتباع واطاعت کرنے کے ذریعے توسل کرنا ہے نہ کہ ان کی جاہ (مرتبہ) کے ذریعہ سے۔

لیکن حامد فقی نے امام احمد کے قول کی جو تاویل کی ہے وہ حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت امام نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ دعاؤں میں آپ ﷺ کے ذریعہ سے توسل کیا کریں۔ اسی طرح امام شافعی کے بارے میں تاریخ خطیب میں ہے جس کو عقود الجمان میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ:

www.darulemaan.com

روی القاضی ابو عبد الله الصمیری والخطیب عن علی بن میمون قال سمعت الشافعی بقول انی لا تبرك بابی حنیفة. ١ ؎(عقودالجمان ص٣٦٣)

قاضی ابوعبداللہاورخطیب بغدادی علی بن میمون سے روایت کرتے ہیں۔وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام شافعیؒ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ میں امام ابوحنیفہ کے ذریعے سے تبرک حاصل کرتا ہوں۔

اسی طرح دیگر متقدمین فقہاے کرام کیاوراقوال بھی موجود ہیں،جن سے ثابت کیا جاتا ہے ہ توسل کی یہ قسم ان کے یہاں مروج تھی اور انہوں نے اسے منع نہیں فرمایا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ متقدمین علماء نے اس قسم کے توسل پر کوئی واضح بحث نہیں کی ہے،جس سے اس مسئلہ کی صحیح اور صاف نشاندہی ہو سکے۔متاخرین (بعد کے دور میں آنے والے علماء) کی رائے یہ ہے کہ یہی مسئلہ سلف صالحین میں موجودتھا ۲؎ وہ ثبوت میں بعض احادیث اورایسے قرائن مثلاً آپ ﷺ کے روضہ مبارک پر سلام کرنا وہاں جا کر دعا کی درخواست کرنا وغیرہ پیش کرتے ہیں۔امام ابوحنیفہؒ سے بھی کچھ اشعار اس بارے میں نقل کیے گئے ہیں۔لیکن اشعار کا اعتبار اس مسئلہ میں اس لیےنہیں کیا جاسکتا اکثر وہ غلبہ حال ومحبت،اظہارشوق یا جدائی کے غم کی وجہ سے ہوسکتے ہیں۔۳؎

اور جوحضرات یہ فرماتے ہیں کہ توسل کی یہ قسم متقدمین اورائمہ کے ہاں نہیں تھی وہ عدم جواز پر متقدمین کے ایسے اقوال پیش کرتے ہیں جواللہ تعالیٰ کی مخلوق کی قسم دینے کے بارے میں ہیں یا مخلوق کے حق کے ذریعہ سے دعا مانگنے کی ممانعت پر وارد ہوئے ہیں۔حالانکہ متقدمین علماء نے ممانعت کی وجہ بھی صاف بیان فرمائی ہے۔

---

١ ؎ عقود الجمان فی مناقب الامام اعظم ابی حنیفه النعمان للمورخ الکبیر الشیخ الاسلام محمد بن یوسف الصالحی الدمشقی الشافعی۔ مکتبه الالمان السمانیه۔ المدین المنورہ۔ ۲؎ اس قسم کی روایات کاتعلق مسئلہ استشفاع سے ہے۔۳؎ یہی حال ان غائبانہ خطابوں کا ہے جو بعض صادق (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

www.qarunegar.com

تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق ثابت ہے۔ان کا قول واضح ہے:

لانه لا حق لمخلوق على الله تعالیٰ

اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا کوئی حق نہیں۔اب توسل کی اس قسم کو ناجائز کہنے والے حضرات درحقیقت مختلف مسائل کو خلط ملط کر رہے ہیں۔اور فی الحقیقت متقدمین کے بعض افعال واقوال اسی توسل کے جائز ہونیکی تائید کرتے ہیں (جیسا کہ اوپر گزر چکا،حضرات امام احمد وامام شافعی وغیرہ کے بارے میں)

اسی طرح متاءخرین علماء کی اکثریت نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے۔بعض نے اس پر مستقل رسالے لکھے ہیں۔حتی کہ بعض علمائے احناف (جو کہ شرک وبدعت کے معاملہ میں نہایت حساس واقع ہوئے ہیں انہوں) نے بھی اس کے جواز پر تصریح کی ہے جیسا کہ ملا علی قاری اپنی آخری تصنیف شرح النقایہ میں لکھتے ہیں:

قِيل ويحرم ان يقول فِي دعائِه بحقِ فلان نبيا كان او وليا اوبحقِ البيتِ اوِ المشعرِ الحرامِ لِانه لاحق لِلخلقِ على الله لكِن قد يقال اِنه لاحق لهم وجوبا مِن اصلِه لكِن الله جعل لهم حقا فضلا او يراد بِالحقِ الحرمة والعظمة فيكون مِن بابِ الوسِيلةِ وقد قال الله تعالىٰ وابتغوا اِليهِ الوسِيلة وقد عد مِن اداب الدعآ التوسل بِالانبِيا والاولِيا ء على

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) زبانوں سے نکلی ہیں مثلا یا رسول اللہ، یا محمد واہ محمد وغیرہ یہ سب کچھ اظہار محبت یا حسرت وغیرہ میں ہوا کرتے ہیں۔جیسے مشفق ماں اپنے بچے کی وفات کے بعد اس کا نام پکارتی ہے۔شعرا اپنے اشعار میں پہاڑوں،جنگلوں،ہواں وغیرہ کو مخاطب ہوتے ہیں۔عشاق اپنے محبوبوں کو غائبانہ پکارتے ہیں۔حالانکہ یہاں کسی خطاب اور پکار سے واقعتہً ندا (پکار) مقصود نہیں ہوتی۔اور نہ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ (یعنی جسے پکارا جاتا ہے) میری پکار کو سن رہا ہے۔بلکہ یہ تو ایسی خطاب وپکار ہوا کرتی ہے جو عشق ومحبت یا حسرت وغیرہ کی وجہ سے زبانوں پر جاری ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی ندا اور پکار پر نہ تو واقعاتی احکام جاری ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ایسے خطابوں سے غائبانہ استشفاع اور توسل پر استدلال کرنا صحیح معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔

www.darulemaan.com

علی ما فِی الحِصنِ الحصِینِ جآ روایته اللهم اِنِی اسئلك بِحقِ السآئِلِین علیك وبِحقِ ممشای اِلیك فاِنِی لم اخرج اشراو لا بطراولا رِ یاء ولا سمعة..... الحدیث (شرح الوقایہ ج۲ص۱۹۶وفی الطحطاوی علی الدرالمختارج۴ص۱۹۹)

کہا گیا ہے کہ بحق فلاں چاہے نبی ہو یا ولی اللہ یا بحق بیت اللہ یا بحق مشعرالحرام دعا میں کہنا حرام ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی حق اللہ پر نہیں ہے لیکن کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا کوئی حق واجب نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حق اور فضل مقرر کر دیا ہے یا اس سے مراد ان کی حرمت اور عظمت کے ذریعے سے (سوال کرنا) ہے، پس یہ وسیلہ کے باب (دائرہ) میں ہو جائے گا (اور) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وسیلہ ڈھونڈو، اور انبیاء اور اولیاء کے ذریعہ سے التوسل کرنا دعا کے آداب میں سے ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس حق کے ذریعہ سے جو سائلین (مانگنے والوں) کا تجھ پر بنتا ہے اور سوال کرتا ہوں اس حق کے ذریعہ سے جو تیری رضا کے لیے میرے چلنے کی وجہ سے (تجھ پر ہے) پس میں نہیں نکلا ہرگز نہیں نکلا فخر کی وجہ سے اور نہ تکبر کی وجہ سے۔

اور علامہ کشمیریؒ کو اس مسئلہ میں کچھ تردد ہے، وہ فرماتے ہیں:

وهذاالنحو جائِز عِند المتاخِرِین ومنع عنه الحافظ رحمه الله تعا لی اِبن تیمِیة واِنِی متردِد فِیهِ لِانه اتی بِعِبارة عنِ لِامامِ مِن تجرِیدِ القدورِی اَن الاِقسام علی اللهِ بِغیرِ اسمائِه لا تـجوز فتمسك بِنفیِ الاِقسامِ علی نفیِ التوسلِ فاِن کان التوسلِ اِقساما فالمسأ لة کما ذهـب اِلیـه ابن تِیمِیة رحِمه الله تعا لی واِن لم یکن اِقساما یبقِی جائِزا.....(فیض الباری ص۳۷۹ ج۲)

یہ توسل متاخرین کے نزدیک جائز ہے اور حافظ ابن تیمیہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ میں خود اس

www.darulfeman.com

میں متردد ہوں۔ کیونکہ ابن تیمیہ نے حضرت امام (ابوحنیفہؒ) کا قول تجرید قدوری سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے مبارک کے بغیر (پکارے) کسی (مخلوق) کی قسم دینا جائز نہیں پس حافظ نے اللہ تعالیٰ کو قسم دینے کی ممانعت کو بنیاد بنا کر توسل کی نفی کی ہے۔ پس اگر توسل (کا مطلب) اللہ تعالیٰ کو قسم دینا ہے۔ پھر تو مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے کہ حضرت حافظ فرماتے ہیں۔ اور اگر توسل اللہ تعالیٰ کو قسم دینا نہیں پھر مسئلہ جائز باقی رہتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ، ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک اعرابی کو جو اندھا تھا ان کلمات سے تعلیم دی اے اللہ تعالیٰ تیرے سامنے تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے جو نبی رحمت ہے التجا کرتا ہوں۔ پھر آگے (اعرابی نے) نے عرض کیا۔ اے اللہ تو ان (حضور ﷺ) کی سفارش کو میرے حق میں قبول فرما:

فثبت مِنه التوسل القولِي ايضا وحِينئذٍ اِنكار الحافِظِ اِبنِ تيمِية تطاول .

تو اس سے قولی توسل بھی ثابت ہوگیا۔ لہٰذا حافظ ابن تیمیہؒ کا اس سے انکار زیادتی ہے۔ (فیض الباری ج۴ ص۶۸)

یہاں علامہ آلوسیؒ کا نظریہ ایسے مسائل میں ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں سے ملتا جلتا ہے وہ ان مسائل پر گہری تحقیق کرتے ہوئے توسل کی اس نوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

وبعد هذا كله انا لا ارى با سا فى التوسل الى الله بجاه النبى صلى الله عليه وآله وسلم عندالله تعالىٰ حيا وميتا، ويراد من الجاه معنى يرجع الى صفة من صفاته تعالىٰ، مثل ان يراد به المحبة التامة المستدعية عدم رده وقبول شفاعته،فيكون معنى قول القائل .الهى اتوسل بجاه النبى صلى الله عليه وآله وسلم ان تقضى لى حاجتى به الهى اجعل محبتك له وسيلة فى قضاء حاجتى ولا فرق بين هذا او قولك: الهى اتوسل

برحمتك ان تفعل كذا اذمعناه ايضاالهى اجعل رحمتك وسيلة فى فعل كذا، بل لا ارى بأ سا ايضا بالاقسام على الله تعالىٰ بجاهه صلى الله عليه وآله وسلم بهذا لمعنى والكلام فى الحرمة كالكلام فى الجاه، ولايجرى ذلك.فى التوسل والاقسام باالذات۔البحت، نعم لم يعهد التوسل باالجاه والحرمة عن احد من الصحابةرضى الله عنهم. ولعل ذلك كان تحاشيا منهم عما يخشى ان يعلق منه فى اذهان الناس اذذاك۔وهم قريبوعهد بالتوسل بالاصنام شئى، ثم اقتدى بهم من خلفهم من الائمة الطاهرين، وقد ترك رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم هدم الكعبةوتاسيسها على قواعدابراهيم لكون القوم حديثى عهد بكفر كما ثبت ذلك فى الصحيح، وهذالذى ذكرته انما هو لدفع الحرج عن الناس والفرار من دعوىٰ تضليلهم. كما يزعمه البعض.فى التوسل بجاه عريض الجاه صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم لا للميل الى ان الدعاء كذلك افضل من استعمال الا دعية الماثورة التى جا بهاالكتاب وصرحت بها السنة السنية، فانه لا يستريب منصف فى ان ماعلمه الله تعالىٰ ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم وعليه الصحابة الكرام رضى الله تعالىٰ عنهم. وتلقاه من بعدهم بالقبول افضل واجمع وانفع واسلم فقد قيل ما قيل ان حقا وان كذبا(بقى ههنا امران) الاول ان التوسل بجاه غير النبى صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم لا بامربه ايضا ان كان المتوسل بجاهه مما علم ان له جاء ها عندالله تعالىٰ كالمقطوع بصلاحه وولايته وامامن لا تقطع فى حقه بذلك فلا يتوسل بجاهه لما فيه من الحكم الضمنى على الله تعالىٰ بما لم يعلم تحققه منه عزشانه، وفى ذلك جرأة عظيمة على الله تعالىٰ الثانى ان الناس قد اكثروا من دعاء غيرالله تعالىٰ من الاولياء الاحياء منهم والاموات وغيرهم، مثل يا سيدى فلان اغثنى، وليس ذلك من

www.darulfeman.com

التوسل المباح فی شئی، واللائق بحال المؤمن عدم التفوه بذلك وان لایحوم حول حماه وقد عده اناس من العلما شرکا وان لایکنه، فهو قریب منه ولا اری احدا ممن یقول ذلك الا وهو یعتقدان ان المدعوالحی الغائب او المیت المغیب یعلم الغیب او یسمع الندا ویقدر بالذات او بالغیر علی جلب الخیر ودفع الاذی والالما دعاه ولا فتح فاه، وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم فالحزم التجنب عن ذلك وعدم الطلب الا من الله تعالیٰ القوی الغنی الفعّال لِمَا یرید.

یعنی ''اس تمام تر بحث کے بعد بھی مجھے حضور ﷺ کی جاہ پر توسل الی اللہ میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، چاہے حضور ﷺ کی زندگی کی حالت میں ہو یا رحلت فرمانے کے بعد ہو۔ اور جاہ سے کوئی ایسا معنی مراد لیا جائے گا، جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف راجع ہو مثلاً اس سے مراد یہ ہو کہ ایسی پکی اور سچی محبت جو عدم رد اور قبول شفاعت کا تقاضا کرتی ہو، پس اس صورت میں قائل کے اس قول، اے اللہ! میں توسل کرتا ہوں، آپ کے نبی کی جاہ پر، کہ آپ میری حاجت پوری کریں، اس کو مطلب یہ ہوگا اے میرے مولا! تجھے جو محبت آپ ﷺ کے ساتھ ہے، اس (محبت) کو میری حاجت پوری کرنے کا وسیلہ بنا دیں۔ پس اس قول میں اور آپ ﷺ کے قول میں کوئی فرق نہیں۔ کہ اے اللہ میں توسل کرتا ہوں آپ ﷺ کی رحمت پر کہ آپ ایسا کر دیجئے۔ کیونکہ اس کا مفہوم بھی یہ بنتا ہے اے اللہ! اپنی رحمت کو (میرے لیے) وسیلہ بنا دے۔ اس عمل میں بلکہ (میرے نزدیک) حضور ﷺ کی جاہ پر اللہ کو قسم دینے میں بھی مضائقہ نہیں۔ اگر یہی پہلے بیان کردہ معنی اختیار کیے جائیں۔ اور (آپ ﷺ کی) حرمت کے ذریعہ سے مانگنے میں ایسا ہی کلام ہے جیسا کہ جاہ کے ذریعہ سے مانگنے میں اور اس جواز کو صرف ذات ہی پر توسل اور اقسام میں نہیں جاری کیا جائے گا۔ البتہ یہ ہے کہ توسل بالجاہ کسی صحابی سے مروی نہیں اور شاید انہوں نے یہ توسل اس لیے نہیں کیا ہو کہ شرک سے حفاظت ہو۔ کیونکہ اس وقت یہ

www.tariqeiman.com

ڈر تھا کہ یہ چیز ان کے اذہان میں پیوست نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ وہ اس وقت بتوں پر توسل کے زمانے سے کچھ قریب تھے۔ پھر آنے والے آئمہ صالحین نے ان کی اقتداء کی اور رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کو گرانے اور اس کو دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرز اور بنیاد پر بنانے (کے خیال) کو ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کی قوم زمانہ کفر کے قریب تھی۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اور میں نے جو جواز ذکر کیا ہے۔ (صرف) اس لیے کہ اس میں لوگوں سے حرج دفع ہو جائے اور توسل کرنے والوں کی طرف گمراہی کی نسبت کرنے سے بچایا جائے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا رسول اللہ ﷺ کی بلند ہستی پر توسل کرنے کے بارے میں (یہ غلط) گمان ہے (کہ ان پر توسل کرنے والے گمراہ ہیں) اور میں نے جو یہ راہ اختیار کی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ میرا میلان اسی طرف ہے کہ اس طرح (توسل بالجاہ سے) دعا مانگنا ان دعاں سے افضل ہے جو ماثورہ ہیں اور قرآن میں آئی ہیں۔ اور سنت (مبارک) کی زبان سے صراحت کے ساتھ نکلی ہیں، کیونکہ اس بات میں کوئی منصف شک نہیں کرے گا کہ جو چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے تعلیم کی ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا ہے اور بعد والوں نے اسکو قبول کیا ہے وہ افضل ہے اور (بہت) کامل پوری ہے اور انفع ہے اور اسلم ہے۔ (اور ہر قسم کے) غل وغش سے محفوظ پاک ہے۔''

اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''یہاں دو باتیں باقی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نبی ﷺ کے علاوہ کسی اور کی جاہ کے ذریعہ پر بھی دعا کرنے پر میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ جس کی جاہ پر توسل کیا جاتا ہے وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جس کی جاہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثابت ہو۔ جیسے کوئی یقینی طور پر صالح اور ولی اللہ ہو (مثلاً انبیا علیہم السلام اور وہ لوگ جن کے بارے میں نبی ﷺ نے واضح طور پر بتایا ہو۔ مثلاً عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جس کے بارے میں ولی اور صالح ہونا ثابت نہیں تو اس کی جاہ پر توسل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ

www.darulfeman.com

پر ایسا حکم لگانا ہے جس کے بارے حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی (پکی) تحقیقی بات نہیں معلوم ہوتی اس میں اللہ تعالیٰ پر ایک عظیم جرات کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے لوگوں نے غیر اللہ سے مانگنے میں بہت کثرت کی یعنی زندہ یا مردہ اولیاء سے مثلاً یوں کہتے ہیں اے فلاں میری مدد کر! اور یہ مباح توسل میں سے نہیں ہے اور مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ اس میں نہ پڑے اور وہ شرک کی حدود کے قریب (بھی) نہ جائے، اور اس کو علماء نے شرک میں سے شمار کیا ہے اور (اگر) یہ شرک نہیں ہے تو اس کے قریب ہے۔ اور میں نہیں دیکھتا کسی کو جو یہ (ایسی باتیں کیا ے فلاں میری مدد کر) کہتا ہو مگر وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس کو وہ پکار رہا ہے (چاہے) وہ زندہ ہے یا مردہ، وہ غیب کو جانتا ہے، اور ہماری ندا کو سنتا ہے اور بذات خود قدرت رکھتا ہے اپنی ذات پر بھی اور غیر پر بھی کہ خیر کو حاصل کرے اور مصیبت کو دفع کرے۔ اگر یہ (اس کا عقیدہ) نہ ہو تو وہ (دعا مانگنے والا) اس سے دعا نہ مانگتا اور نہ دعا کے لئے منہ کھولتا اور اس (غلط) طرز عمل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم آزمائش ہے۔ پس یقینی بات یہ ہے کہ اس سے پرہیز کرنا اور اس رب، اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے جو کہ قوی اور غنی ہے۔ اور وہ کرنے والا ہے اس چیز کو جو وہ چاہے وہ ﴿فعّال لما یرید﴾ ہے۔''

حضرت حافظ ابنِ تیمیہؒ نے دوسری بات یہ کہی تھی کہ یہ توسل (رسول اللہ ﷺ کے طفیل یا جاہ کے ذریعہ سے سوال کرنا، نہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھا نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس توسل کو اختیار کیا گویا ان کے نزدیک یہ بدعت ہے۔

اس پر وہ حضرت عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے واقعات سے استدلال کرتے ہیں جیسا کہ بخاری شریف ابواب الاستسقا میں ہے۔

(۱):((عن انس بن مالك ان عمر ابن خطابؓ كان اذا قحطوا استسقى بالعباس بن عبد المطلب رضى الله عنه فقال اللهم انا كنا نتوسل اليك بنبينا صلى الله تعالىٰ عليه

www.qaruleman.com

وآلہ وسلم فتسقینا وانا نتوسل الیك بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون))(بخاری ج ۱ ص ۱۳۷)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوجاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کرتے اور کہتے اے اللہ! ہم تیرے پاس تیرے نبی ﷺ کا وسیلہ لے کر آیا کرتے تھے تو تو ہمیں سیراب کیا کرتا تھا اب ہم لوگ اپنے نبی کے چچا یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ لے کر آتے ہیں ہمیں سیراب کر۔ (راوی کہتے ہیں) پھر وہ لوگ سیراب کئے جاتے (یعنی بارش ہوجاتی)۔''

(۲):اسی طرح شام میں جب لوگوں پر قحط پڑا تو معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید بن اسود قریشی رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی وہ کہتے تھے:

اللھم نستشفع او نتوسل بخیارنا ۔اے اللہ! ہم شفاعت طلب کرتے ہیں یا وسیلہ اختیار کرتے ہیں ان لوگوں کا جو ہم میں سے بہترین (سب سے زیادہ نیک) ہیں پھر اس کے بعد فرمایا:

((یا یزید یدك فرفع یدیه ودعا ودعا الناس حتی سقوا))

اے یزید ہاتھ اٹھا (یعنی دعا کر) تو انہوں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی اور لوگوں نے (بھی) دعا کی حتی کہ وہ سیراب کئے گئے۔

ان حدیثوں کے پیشِ نظر حافظ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال حضرات کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اگر وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک کے وسیلہ سے دعا مانگنی جائز ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی آپ ﷺ کو نظر انداز نہ کرتے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مجمع میں آپ ﷺ کا وسیلہ چھوڑ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ کبھی اختیار نہ کرتے۔اسی طرح ان کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ ﷺ کا وسیلہ چھوڑ کر یزید بن اسود رضی اللہ عنہ کا وسیلہ اختیار کیا۔تو یہ واقعات اس بات کی دلیل

www.darulfeeman.com

ہیں کہ کسی بھی مخلوق کی ذات کو توسل کا ذریعہ بنانا جائز نہیں چاہیے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ کیونکہ یہاں بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کو ذریعہ نہیں بنایا گیا اور نتوسل الیك بعم نبینا سے مراد نتوسل الیك بدعا عم نبینا ہے یعنی ہم لوگ اپنے نبی کے چچا کی دعا کا وسیلہ لے کر آتے ہیں۔ یہاں ان سے دعا کروانا مقصود تھا نہ کہ ان کی ذات پر توسل کرنا۔

اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ یہاں یہ دعویٰ کرنا کہ لفظ دعا (جو مضاف ہے عم یعنی چچا کی طرف) کو حذف کیا گیا ہے۔ غلط ہے، یہ محض ان کے ذہن کی ایجاد ہے حدیث شریف اس سے پاک ہے۔ اس حدیث میں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دعا مانگنا ثابت ہوتا ہے اور منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ذہن کی ایجاد نہیں بلکہ انہی روایات میں اس کا قرینہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ پھر ان ہی حضرات سے دعا کروائی گئی، جس سے صاف ظاہر یہ ہے کہ یہاں توسل سے مراد صرف ان سے دعا کروانی تھی نہ کہ ان کی ذات پر توسل کرنا اور قائلینِ توسل کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن اسود رضی اللہ عنہ پر توسل کرنے کے بعد انہی سے دعا کروائی۔ اس طرح بعض روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی یہ آتا ہے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی اور پھر ان کی درخواست پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی دعا کی۔ جس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک نیک آدمی دوسرے نیک آدمی سے دعا کے لیے گزارش کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے درجہ میں کم ہو۔ بڑے یا چھوٹے ہونے کا فرق نہیں۔ حدیث ابی صالح رضی اللہ عنہ میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ممبر پر رونق افروز ہوئے تو ساتھ ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما ہوئے۔ پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا کی:

((اللھم انا توجھنا الیك بعم نبیك و صنوا ابیه فاستقنا الغیث ولا تجعلنا من القانطین.))

www.ahlehaq.com

اے اللہ! ہم تیرے نبی ﷺ کے چچا اور ان کے باپ کی مثل کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہم پر رحمت کر بارش برسا اور ہمیں مایوس نہ فرما۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: قل یا ابا الفضل کہ آپ بھی کچھ فرمائیے اے ابوالفضل۔ تو انہوں نے یوں دعا کی جس کا مفہوم یہ ہے:

((اللھم لم ینزل بلا الا بذنب ولم یکشف الا بتوبة وقد توجه بی القوم الیك بالذنوب ونوا اصینا بالتوبة فاسقنا الغیث))

اے اللہ مصائب کا نزول گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ مصائب توبہ ہی سے دور ہوتے ہیں، تیرے نبی ﷺ کے ساتھ مجھے جو تعلق، عزت و منزلت حاصل ہے اس کے سبب قوم نے مجھے آپ کے حضور میں وسیلہ بنایا ہے ہم اپنے گناہ آلودہ ہاتھ پھیلائے حاضر ہیں اور توبہ و ندامت سے سر جھکائے ہیں، پس ہم پر رحمت کی بارش برسا۔

اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر توسل کے ساتھ ساتھ ان سے دعا کروانا بھی مقصود تھا۔

اور علامہ الزرقانی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: فاتخذوه (یعنی العباس) وسیلة الی الله ۔ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے وسیلہ پکڑو، بلکہ الاستیعاب میں ابن عبد البر نے استسقا عمر رضی اللہ عنہ کا سبب بھی بیان کیا ہے۔

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بہت سخت قحط پڑ گیا۔

((فقال کعب یا امیر المؤمنین ان بنی اسرائیل کانوا اذا اصابهم مثل هذا استسقوا بعضة الانبیاء فقال عمر هذا عم رسول الله صلی الله علیه وسلم وصنوابیه وسید بنی هاشم فمشی الیه عمر وشکا الیه.))

www.qaureeman.com

''تو حضرت کعب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے امیر المومنین جب بنی اسرائیل ایسی مصیبت میں مبتلا ہوتے تو انبیا علیہم السلام کی جماعت کے ذریعے توسل کرتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ رسول اللہ کے چچا مثل باپ ہیں اور بنی ہاشم کے سردار ہیں۔ پس ان کے پاس چلے گئے اور اس قحط کی شکایت کی۔''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توسل بالذات ہے جو کہ قرابت رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ہے۔

جب توسل بالذات ثابت ہوجاتا ہے تو اس حدیث کی وجہ سے جوازِ توسل کو صرف زندوں کے ساتھ خاص کرنا بھی صحیح نہیں کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ زندہ شخصیت پر توسل تو اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نیک اور مقرب ومقبول بندہ ہے اگر وہ وفات پاجاتا ہے تو موت کے ساتھ اس کی نیکی اور مقبولیت تو زائل نہیں ہوجاتی کہ ان کے مرنے کے بعد توسل کو لغو یا ناجائز قرار دیا جائے۔

پس حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے دعا کرنے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے ذریعے توسل صحابہ کے ہاں ناجائز تھا اور نہ ہی انہوں نے وضاحت کی ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کا وسیلہ اختیار کرنا چونکہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے مجبوراً آپ ﷺ کے چچا عباس کو وسیلہ بنایا۔ بلکہ حدیث میں یہ جملہ قابل غور ہے: انا نتوسل الیك بعم نبینا ہم تیرے حضور میں اپنے نبی ﷺ کے چچا کا وسیلہ لے کر آئے ہیں یہ نہیں کہا گیا کہ ہم تیرے حضور میں عباس بن عبدالمطلب یعنی عباس جو بیٹا عبدالمطلب کا ہے، کا وسیلہ لے کر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے اس میں بھی دراصل حضور ﷺ ہی کو وسیلہ بنایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی نسبت کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ اس حدیث مبارک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ توسل، زیادہ نیک آدمی یا فاضل کی موجودگی میں بھی ایک کم درجہ کے نیک آدمی یا مفضول کے ذریعے بھی جائز ہے۔ جیسا کہ کسی سے دعا کی درخواست کرنا، فاضل اور مفضول دونوں سے جائز ہے۔

اور اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایات

www.darulemaan.com

سے تو صاف ظاہر یہ ہے کہ مقصود ان حضرات کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ کے وسیلہ اور ذریعہ اللہ تعالیٰ سے بارش کی درخواست کرنی تھی اور اس کے لیے انہی حضرات سے دعا کروانی تھی۔ رہا کسی ذات پر توسل کرنا تو ان روایات میں اس کا بہت کم احتمال ہے۔[1]

غرض مذکورہ بالا روایات میں قائلین اور مانعین دونوں کے لیے بحث ومباحثہ کی کافی گنجائش موجود ہے ور جو لوگ توسل کا انکار کرتے ہیں وہ طبرانی وغیرہ کی ایک حدیث سے اس کے منع پر استدلال کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

ایک منافق مسلمانوں کو تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

قوموا نستغيث برسول الله من هذاالمنافق فقال رسول الله صلى الله عليه واله وسلم انه لا يستغاث بى و انما يستغاث بالله چلو کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس منافق کے خلاف فریاد لے جائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ فریاد مجھ سے نہیں کی جاتی۔ فریاد تو خاص اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے۔

اس حدیث کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اگر اس کو مانا بھی جائے تو اس کا صحیح مفہوم اور تفصیل کو ایک دوسری حدیث شریف سے معلوم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سنن ابی داود میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا، جانیں مشقت میں

---

[1] وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کے زمانے میں جب بھی قحط ہوتا اس کا حضرت عباس پر استسقا (بارش مانگنے کی دعا) کرنا، اور ان کو وہاں حاضر کرنا، اللہ تعالیٰ سے بارش کے بارے میں انہی سے دعا کروانا تو یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا توسل حضرت عباس پر یہ تھا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرواتے تھے، نہ ان کی ذات کو وسیلہ بنا کر از خود اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرتے کہ یا اللہ آپ کے نبی ﷺ کے طفیل ہم پر بارش نازل فرمائیے۔

www.ahlehaq.com

ڈال دی گئی ہیں اور اہل وعیال بھوکے ہیں، اموال میں نقصان پڑ گیا ہے اور مویشی ہلاک ہو گئے ہیں۔

فاستسق الله لنا فانانستشفع بك على الله و نستشفع بالله عليك فقال النبى صلى الله عليه واله وسلم سبحان الله سبحان الله فما زال يسبح حتى عرف ذلك فى وجوه اصحابه ثم قال و يحك انه لا يستشفع بالله على احد شان الله اعظم من ذلك(رواه ابوداود مشكوٰة باب بدالخلق)

سو آپ ﷺ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں ہم آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے شفاعت طلب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ذریعہ آپ ﷺ سے شفاعت طلب کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ سبحان اللہ، آپ دیر تک تسبیح پڑھتے رہے یہاں تک کے صحابہ کرام ﷺ کے چہروں پر (اس اعرابی کیلئے) غصے کے آثار ظاہر ہو گئے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تیری حالت پر افسوس، اللہ تعالیٰ کو ذریعہ بنا کر کسی سے شفاعت نہیں کی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بڑی ہے۔

اب یہاں حضور ﷺ نے اعرابی کے اس قول نستشفع بالله عليك (یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو ذریعہ بناتے ہیں آپ ﷺ کے پاس شفاعت کا) کی تو تردید کی اور منع فرمایا لیکن اس کے پہلے قول انا ستشفع بك على الله (کہ ہم آپ ﷺ کو ذریعہ بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کا) پر کوئی انکار نہیں فرمایا اور اس قول کو جواز پر ہی برقرار رکھ دیا گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حدیث شریف کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ذریعہ بنا کر کسی مخلوق سے فریاد یا شفاعت نہیں کی جاتی۔ لیکن مخلوق کو ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے توسل اور شفاعت جائز ہے۔ لیکن اس کا جواب منکرینِ توسل یہ دیتے ہیں کہ مخلوق پر توسل اور ان سے سفارش کروانے سے مراد یہ ہے اگر وہ زندہ ہے تو ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی درخواست کی جائے نہ کہ اس کی شخصیت پر توسل کرنا۔

www.darulemaan.com

قائلین توسل کے دلائل!

الغرض جن احادیث سے حافظ ابن تیمیہ اوران کے ہم خیال متنازع فیہ توسل کے منع پر استدلال کرتے ہیں انہی روایات اور متقدمین کے اقوال سے ان کے مخالفین اس کا جواز ثابت کرتے ہیں اس کے علاوہ توسل کے قائلین قرآن مجید کی آیات، احادیث اور آثار سے بھی جواز میں پیش کرتے ہیں، جن میں سے چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں:

﴿ولـمـا جآ هم كتٰب مِن عِند اللّٰهِ مصدِّقٌ لِما معهم و كانوا مِن قبل يستفتحون على الذِين كفروا فلما جآءهم ما عرفوا كفروا بِه فلعنة اللّٰهِ على الكافِرين﴾ (سورۃ البقرہ:۸۹)

''اور جب آئی ان کے پاس کتاب (قرآن مجید) جو تصدیق کرتی ہے اس (کتاب تورات) کی جو ان کے پاس ہے اور وہ اس سے قبل (اس کی برکت سے) کافروں پر فتح مانگتے تھے۔ تو پھر جب ان کے پاس وہ نبی آئے جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے، سو پھٹکار ہو کفر کرنے والوں پر۔''

یہاں یہود کے دانستہ کفر اور تعصب کی ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ تورات اور انجیل میں حضور ﷺ کی بعثت کے متعلق جو بشارتیں موجود تھیں، ان کی وجہ سے یہود نبی کریم ﷺ کی بعثت کا شدید انتظار کر رہے تھے۔ اور اپنے دینی اور دنیاوی مقاصد میں کامیابی اور اپنے مخالفین پر فتح مندی کو آپ ﷺ کی بعثت پر منحصر سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ سے جس طرح فتح طلب کرتے تھے اس کے بارے میں مختلف اسبابِ نزول آئے ہیں۔ ان میں سے دو کو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے اور یہ دونوں باقی شانِ نزول سے زیادہ قوی ہیں۔ پہلی شانِ نزول علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہود رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے اوس وخزرج کے مشرکین پر اللہ تعالیٰ سے فتح مانگتے تھے جیسا کہ سدی سے روایت ہے کہ جب

www.darulemam.com

ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ سخت ہو جاتی اور فتح کی کوئی ظاہری صورت نہ رہتی تو اس وقت تورات کو سامنے رکھ کر کھولتے اور ان مقامات پر ہاتھ رکھ کر دعا کرتے، جہاں نبی کریم ﷺ کی صفات اور کمالات کا ذکر ہوتا تو یوں دعا کرتے:

((اللھم انا نسئلك بحق نبیك الذی وعدتنا ان نبعثه فی اخر الزمان ان تنصرنا الیوم علی عدونا فینصرون.)) (روح لمعانی ج ۱ طبع بلادمصر)

اے اللہ ہم تجھ سے تیرے اس نبی کے حق (یعنی حرمت طفیل سے) سے سوال کرتے ہیں۔ جس کی بعثت کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ آج تو ہمیں اپنے دشمن پر فتح دے پس ان کی مدد کی جاتی۔

حاکم اور بیہقی نے ایک ضعیف سند سے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے جس میں ہے کہ خیبر کے یہود دشمن کے مقابلے میں اس طرح کی دعا کرتے تھے:

((اللھم انا نسئلك بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا اخرالزمان .))

''اے اللہ! ہم تجھ سے امیّ نبی محمد ﷺ کے حق (یعنی حرمت طفیل سے) سے سوال کرتے ہیں، وہ (نبی ﷺ) جس کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ تو اس کو ہمارے لیے آخری زمانہ میں مبعوث فرمائے گا۔''

اس کے علاوہ تفسیرِ کبیر میں علامہ رازی نے اس آیت کی شانِ نزول میں پانچ وجوہ تحریر کی ہیں۔ ان میں سے دو ایسی ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہود کا توسل کرنا ثابت ہوتا ہے اور تفسیرِ ابنِ کثیر میں بھی اس کے قریب قریب روایت نقل کی گئی ہے۔ اگرچہ ان کے نزدیک ترجیح دوسری روایت کو معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح تفسیر علامہ ابی مسعود اور امام السیوطی نے بھی اپنی تفسیر میں کچھ ایسی روایتیں جمع کی ہیں جن میں بعض سے توسل بالنبی ﷺ صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔ (دیکھئے الدرالمنثور:۱/ ۸۸)

دوسری وجہ سببِ نزول میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب اپنی ترقی اور فتح مندی کا انحصار آپ ﷺ

کی بعثت اور تشریف آوری پر سمجھتے تھے اور مشرکینِ عرب سے کہتے تھے کہ عنقریب محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تم کو ختم کر ڈالیں گے۔ جیسا کہ تفسیر ابنِ کثیر میں اس کو قتادہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اور ابوالعالیہ رحمہ اللہ سے بھی اس کی تفسیر منقول ہے کہ:

((کانت الیھود تستنصر بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم علی مشرکی العرب فیقولون اللھم ابعث ھذاالنبی الذی نجدہ مکتوبا عندنا حتی تعذب المشرکین ونقتلھم .)) (ابن کثیر: ۱/۱۲۴)

یہود آپ ﷺ کے ذریعے مشرکین عرب کے مقابلہ میں نصرت طلب کرتے تھے کہتے تھے اے اللہ بھیج یہ نبی جس کا ذکر ہم (تورات وانجیل) میں پاتے ہیں تا کہ ہم مشرکین کو عذاب دیں اور ان کو قتل کر دیں۔

اسی طرح تھوڑے سے فرق کے ساتھ عبداللہ ابن عباس ﷺ سے بھی روایت منقول ہے۔

الغرض اہل کتاب کا رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فتح ونصرت طلب کرنے کا مطلب، ان روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آپ ﷺ عنقریب دنیا میں تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ ہو کر مشرکین کے خلاف جنگ کریں گے اور ان پر فتح حاصل کریں گے۔ پس وہ اللہ سے یہی سوال کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس نبی موعود کو جلدی بھیج دے تا کہ ان کو فتح حاصل ہو جائے۔

اب جو حضرات توسل کو منع فرماتے ہیں وہ اس دوسری روایت کو لیتے ہیں اور سببِ نزول کی پہلی مذکورہ روایت کو دوسری کی نسبت کمزور سمجھتے تھے۔ جب دوسری روایت زیادہ قوی ہوئی تو اس آیت سے توسل بالنبی ﷺ پر استدلال صحیح نہیں بلکہ بعض مفسرین نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ آپ کی بعثت سے قبل وہ آپ کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتے تھے (ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں) مگر آپ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ منکر ہو گئے۔ لیکن اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ان دونوں روایتوں میں تقابل یا تضاد کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو تو مان لیا جائے اور دوسری کو مکمل طور

www.qariraa.com

پر خارج کر دیا جائے، بلکہ دونوں روایتیں اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہیں۔اہل کتاب آپ ﷺ کی ذات مبارک کو توسل کا ذریعہ بھی بناتے ہوں گے اور آپ ﷺ کی تشریف آوری کی دعا بھی کرتے ہوں گے اور یہی بات اس دوسری تفسیر کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے کہ اہل کتاب مشرکین عرب کے سامنے آنحضرت ﷺ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہیں اور وہ آپ ﷺ کے طفیل سے دعا بھی مانگتے۔اس میں تقابل وتعارض نہیں۔اسی طرح جتنی تفسیریں اور اسبابِ نزول بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی تضاد ایسا نہیں کہ ایک کو مان لیا جائے تو دوسرے کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے، بلکہ حافظ ابنِ تیمیہ کے شاگرد حافظ ابن قیم ؒ نے بھی بدائع الفوائد میں پہلی تفسیر کو نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

((ان اليهود يحاربون جيرانهم من العرب فى الجاهليه ويستنصرون عليهم بالنبى صلى الله عليه وسلم قبل ظهوره فيفتح لهم و ينصرون عليهم....)) (بدائع الفوائد:۴/۱۴۵)

''زمانہ جاہلیت میں یہود اپنے عرب پڑوسیوں سے لڑتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے نبی ﷺ کے ذریعہ (یعنی ان کے وسیلہ سے) نصرت اور مدد طلب کرتے تھے تو ان کو فتح ہو جاتی اور ان کی مدد کی جاتی۔''

قائلین کا احادیث سے استدلال!

(۱):حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے جب (بھول کر) لغزش ہوئی (جس کی وجہ سے جنت سے دنیا میں بھیج دیئے گئے تو ہر وقت روتے تھے اور دعا و استغفار کرتے رہتے تھے۔ایک مرتبہ) آسمان کی طرف منہ کیا اور عرض کیا:((اسئلك بحق محمد غفرت لى.)) ''اے اللہ محمد ﷺ کے وسیلہ سے تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں۔'' وحی نازل ہوئی کہ محمد ﷺ کون ہیں (جن کے واسطہ سے تو نے استغفار کیا) عرض کیا کہ جب آپ نے مجھے پیدا کیا تو میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔لااله الا الله محمد الرسول الله تو میں سمجھ گیا کہ محمد ﷺ سے (مخلوق میں) اونچی ہستی نہیں ہے جن کا نام آپ نے اپنے نام کے ساتھ رکھا ہے۔وحی نازل ہوئی کہ وہ

www.darulemaan.com

خاتم النبین ہیں، تمہاری اولاد میں سے ہیں، لیکن اگر وہ نہ ہوتے تو تم پیدا نہ کئے جاتے۔[۱]

اس کے جواب میں منکرین توسل فرماتے ہیں کہ پہلے تو حدیث بہت کمزور ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید کے مقابل ہے اس لیے اس پر کسی طرح استدلال نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید اور دوسری صحیح احادیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی جو دعائیں ذکر ہیں۔ ان میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں۔

لیکن اس کے اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ فی الواقع حضرت آدم علیہ السلام نے اس وقت کیا کیا دعائیں کی ہوں گی اور کس کس طرح سے گڑگڑائے ہوں گیا اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی تعارض اور تقابل نہیں کیونکہ جس پر مالک کی ناراضگی ہو وہی جانتا ہے کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ پھر ایسے شخص پر جس کو فرشتوں سے سجدہ کروایا اپنا مقرب بنایا۔ جو شخص جتنا مقرب ہوتا ہے اتنا ہی عتاب کا اثر اس پر زیادہ ہوتا ہے۔ بشرط یہ کہ کمینہ نہ ہو اور وہ تو نبی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کی آدم علیہ السلام اتنے روئے تھے کی تمام دنیا کے تمام آدمیوں کا رونا اگر جمع کیا جائے تو ان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چالیس سال تک سر اوپر نہیں اٹھایا اس لئے اگر دوسری دعاؤں کے ساتھ یہ بھی ہو کہ انہوں نے حضور ﷺ کا وسیلہ اختیار فرمایا ہو تو اس میں تعارض اور تضاد کی بات نہیں البتہ حدیث ضعیف ضرور ہے لیکن اس توسل کے بارے میں اور احادیث بھی ہیں جن سے اس کی تائید ہوسکتی ہے۔

(۲)((عن امیه بن خالد بن عبدالله بن اسید عن النبی صلی الله علیه واله وسلم انه کان تستفتح بصعالیك المهاجرین.۲؎))(رواه فی شرح السنته مشکومشکوة باب فضل الفقراء)

۱؎ اخرجه الطبرانی فی الصغیر والحاکم و ابو نعیم والبهیقی کلاهما فی الدلائل وابن عساکر و فی الدرر وفی مجمع الزوائد رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه من لم اعرفهم۔

۲؎ قال الملا علی قاری ثم رائت فی الجامع انه رواه ابن شیبه والطبرانی عن امیه بن عبد الله و لفظه کان ﷺ یستفتح و یستنصر بصعالیك المسلمین .(المرقاة)

حضرت امیہ بن خالد بن اسید نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ فقرائے مہاجرین کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے فتح طلب کرتے تھے۔

اور ملا علی قاریؒ، ابن ملکؒ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ فقرائے مہاجرین کے توسل سے اس طرح دعا مانگتے تھے:

اللهم انصرنا على الاعدا بحق عبادك الفقرا المهاجرين .(المرقا ة كتاب الرقاق)

اے اللہ ہماری مدد فرما دشمنوں (کفار) کے مقابلے میں تیرے فقرا مہاجرین بندوں کے حق (وسیلہ سے)۔

اور شیخ عبدالحق اشعت اللمعات میں یوں نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ دعا میں اس طرح کہتے تھے:

((اللهم انصرنا بفقرا المهاجرين))

''اے اللہ ہماری مدد فرما فقراء مہاجرین کی برکت یا وسیلہ سے۔''

اس سے منکرینِ توسل یہ جواب دیتے ہیں کہ آپ ﷺ فقرا مہاجرین کی دعا کے ذریعے فتح مانگتے تھے نہ یہ کہ ان کی ذات پر توسل کرتے تھے۔ اس بات کو قائلین توسل رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور حدیث شریف سے تو یہی توسل معلوم ہوتا ہے اور اس پر مرقات اور اشعت اللمعات کے حوالوں کی شہادت بھی موجود ہے۔

منکرین توسل کی طرف سے جواب یوں دیا جاتا ہے کہ دعویٰ بلا دلیل نہیں بلکہ اس پر قوی دلیل موجود ہے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بہت دلیر، بہادر، قوت والے اور سخی شخص تھے۔ ان کا بیٹے مصعب بن سعد رضی اللہ عنہما صحیح بخاری میں ان سے روایت کرتے ہیں کہ (حضرت) سعد (یعنی اس کے باپ) کو یہ گمان ہو گیا کہ ان کو ان سے کم تر (ضعیف) اور فقیر شخص پر فضیلت حاصل ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

((هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم))(بخاری کتاب الجهاد ص :٢/٤٠٥)

یعنی تمہاری مدد (دشمنان اسلام پر) نہیں کی جاتی اور نہ تمہیں رزق دیا جاتا ہے مگر اپنے ضعفاء کی برکت سے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ خیال اور گمان ہوا کہ ان سے کمزور اور ضعفا کی نسبت اسلام کو زیادہ نفع ہے تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس گمان کی اصلاح کی اور یہ کلمات ارشاد فرمائے (اور ان کلمات میں امت کو یہ بتایا کہ یہ گمان رکھو کہ آپ کو قوت، شجاعت وغیرہ کی وجہ سے دوسرے فقرا اور کمزور مسلمانوں پر فضیلت حاصل ہے بلکہ انہی ضعفاء اور کمزور مسلمانوں کی مخلصانہ دعاؤں کی برکت سے آپ کو کفار ومشرکین پر فتح حاصل ہوتی ہے اور رزق بھی۔)

یہاں تو ظاہر ہے کہ ضعفاء اور کمزوروں کے طفیل دعا مانگنا مقصود نہیں اور نہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان پر توسل کر کے دعا کی تھی بلکہ یہاں مراد صرف ان کے اخلاص اور دعا کی برکت بتانا ہے اور کمزور، ضعیف لوگوں کو کم تر نہ سمجھنے کی تعلیم ہے پس اسی طرح مذکورہ بالا حدیث سے بھی مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء مہاجرین کی دعا کے ذریعے فتح مانگتے تھے۔

(۳):اسی طرح ابن ابی شیبہ نے بسندِ صحیح مالک دار جازن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے خلافت میں قحط پڑ گیا تو ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر تشریف لے گیا اور کہا:((یا رسول الله !استسق الله لامتك فانهم قد هلكوا فاتاه رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فى المنام فقال ائت عمر فاقرئه السلام واخبره انهم يسقون.))(الحدیث)

((الوفاالوفا :٤/١٣، مطبوعه احياء الترا ث العربى.))

اے رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے بارش مانگ لیں، وہ تو ہلاک ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خواب میں آئے اور فرمایا کہ عمر کے پاس جا، ان کو سلام کہنا اور خبر دینا کہ ان پر بارش برسائی جائے گی۔

اس حدیث سے استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے آپ ﷺ سے درخواست کی جب کہ آپ برزخ میں ہیں (گویا یہ توسل میں مبالغہ ہے جس کا تعلق مسئلہ استشفاع سے ہے) تو اس پر نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار فرمایا اور نہ کسی صحابی نے ان کے اس فعل کو برا جانا۔

اس روایت پر مانعین توسل اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں خواب دیکھنے والا شخص نامعلوم ہے کہ یہ شخص کون تھا اس کا نام کیا تھا، صحابی تھا یا غیر صحابی وغیرہ۔

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ خواب دیکھنے والا کوئی نامعلوم شخص نہیں بلکہ وہ ایک صحابی ہیں جن کی نشاندہی سیف بن عمر نے الفتوح میں کی ہے کہ خواب دیکھنے والے ایک صحابی تھے جن کا نام بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ المزنی ہے، لیکن مانعین اس کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں سیف بن عمر ایک ایسا راوی ہے جس پر آئمہ جرح وتعدیل نے سخت تنقید کی ہے بلکہ بعض نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ واقدی کی طرح جھوٹی اور من گھڑت حدیثیں گھڑتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ سیف بن عمر بہت ہی کمزور اور ضعیف راوی ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور صرف اس کی روایت پر اعتبار کر کے اس شخص سے حضرت بلال بن الحارث المزنی مراد لینا صحیح نہیں۔ لہٰذا روایت میں اس شخص کو بدستور ایک نامعلوم شخص سمجھا جائے گا۔ اس کے جواب میں قائلین کہتے ہیں۔ اگر مان لیا جائے کہ خواب دیکھنے والے کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے لیکن مالک الدار ایک ثقہ راوی ہیں جو اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اس مسئلہ کو ایک نامعلوم شخص کے خواب اور اس کے توسل کرنے پر استدلال کر کے اس کو ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور انہیں خبر دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا اے میرے رب! میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی مگر جس امر سے میں عاجز ہو گیا۔ تو یہاں استدلال اس بات سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس شخص کے خواب اور اس کے اسی طرح توسل کرنے پر کوئی انکار نہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس توسل کو جائز

www.Qaurieman.com

سمجھتے تھے ورنہ حضرت عمرؓ اس پر ضرور انکار فرماتے اور اس کی اس کاروائی پر اس کی تغلیط کرتے۔

اسی طرح اس حدیث میں قائلین اور مانعین دونوں کے لیے بحث کی کافی گنجائش ہے۔ نیز دونوں فریق اس حدیث کی سند پر بھی بحث کرتے ہیں کوئی اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نے اس کو کمزور اور نا قابل اعتبار بنانے کی زور آزمائی کی ہے۔لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس طرح اس حدیث کو بالکل صحیح اور بے غبار ثابت کرنا سخت مشکل ہے اسی طرح یہ بھی آسان نہیں کہ اس کو ایسا کمزور اور نا قابل اعتبار ثابت کرکے بالکل مسترد کیا جائے۔واللہ اعلم۔

(۴): اور سنن الدارمی میں حضرت ابوالجوزاءؓ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کے لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کرکے اس کا علاج دریافت کیا:

((فقالت انظر واقبر النبی صلی الله علیه واله وسلم فاجعلوامنه کواالی السما حتی لا یکون بینه و بین السماء سقف ففعلوا فمطرا حتی لا یکون بنت العشب وسمنت الابل حتی تفقت من الشحم فسمی عام الفتق.(رواه الدرامی مشکوٰة ،باب الکرامات ـــ ۱)

پس عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نبی کی قبر مبارک کو دیکھ کر آسمان کی طرف روشن دان بنا۔ یہاں تک کہ اس قبر اور آسمان کے درمیان چھت (حجاب) نہ رہے لوگوں نے ایسا ہی کیا سوان پر بہت بارش برسائی گئی یہاں تک کہ گھاس اگی اور اونٹ موٹے ہوگئے اور چربی سے پھول گئے تو اس سال کا نام فتق رکھا گیا۔اس واقعہ میں آپ ﷺ ہی کے توسل میں مبالغہ کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا۔

جیسا کہ شیخ عبدالحقؒ اشعت اللمعات میں لکھتے ہیں:

''کہ درحقیقت استسقا واستشفاع ست بذاتِ شریف وکشف قبر مبالغہ است درآن۔'' (اشعت اللمعات کتاب الفتن باب الکرامات الفصل الثالث)

۱ سنن الدرامی ج اول ص مطبوعہ نشر السنتہ ملتان پاکستان

www.urduweb.com

یعنی حقیقت میں یہ استسقاء اور ذات شریف پر توسل کرنا ہے اور قبر (کی طرف اوپر سے کھڑکی) کھولنا توسل میں مبالغہ کے لیے ہے۔

اسی طرح ملا علی قاریؒ نے بھی مشکوٰۃ کی شرح مرقات میں لکھا ہے۔ (دیکھئے مرقات: ۱۳۲/۱۱، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ پہلے تو اس حدیث کی سند پر تنقید موجود ہے۔ اگر اس کی سند کو معتبر بھی تسلیم کیا جائے پھر بھی اس سے قولی توسل (یعنی زبانی یوں کہنا کہ نبی کریم ﷺ کے طفیل ہم پر بارش نازل فرما دیجئے) ثابت کرنا صحیح نہیں۔ قائلین توسل کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا توسل میں مبالغہ ہے۔ واللہ اعلم۔

(۵): حضرت فاطمہ بن اسد رضی اللہ عنہا (جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں) کی وفات پر حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے اور ان کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا: ''ماں! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے۔'' اسی حدیث میں ہے کہ آگے حضور ﷺ نے یہ دعا کی:

((اللہ الذی یحیی ویمیت وھو حی لا یموت اغفر لامی فاطمہ بنت الاسد ولقنھا حجتھا ووسع علیھا مدخلھا بحق نبیك والانبیا قبلی فانك ارحم الراحمین.))

''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے وہ زندہ ہے کبھی نہیں مرتا۔ اے اللہ! بخش دے میری ماں فاطمہ بنت اسد کو اس کو حجت تلقین فرما اور فراخ کر دے اس کی قبر تیرے نبی ﷺ کے حق کے ذریعہ اور جو انبیا علیہم السلام مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں (ان کے حق کے طفیل) بے شک آپ ہی ارحم الرحمین (سب سے زیادہ رحم کرنے والے) ہیں۔[۱]'' (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

---

[۱] قال الھیثمی رحمہ اللہ وفیہ روح بن صلاح وثقہ ابن حبان والحاکم و فیہ ضعف بقیہ رجالہ رجال الصحیح. (مجمع الزوائد: ۹/ ۲۵۷)

www.darulegman.com

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

(۶): حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی روایت جو متعدد کتابوں میں موجود ہے اور امام ترمذیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے، ایسی ہے۔

ایک نابینا شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضرت آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو عافیت دے اور بینائی دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر چاہے تو دعا کروں اگر چاہے تو صبر کر لے اور صبر ہی تیرے لیے بہتر ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ حضرت آپ دعا کیجئے۔ آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ اچھی طرح وضوء کرے اور یہ دعا کرے:

((اللھم انی اسئلك واتوجه اليك بنبيك محمد نبی الرحمة انی توجهت بك إلى ربی فی حاجتی هذه لتقضی لی۔ اللھم فشفّعه فیّ.)) (رواه الترمذی فی ابواب الدعوات وقال هذا حديث حسن غريب)

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی محمد ﷺ رحمت والے نبی ﷺ کے وسیلہ سے متوجہ ہوتا ہوں۔ اے نبی میں تیرے وسیلے کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ میری یہ حاجت پوری کی جائے (اے اللہ) آپ میرے بارے میں حضور ﷺ کی شفاعت کو قبول فرمائیں۔''

اس حدیث کے جواب میں منکرین توسل کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ اس میں درخواست اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے ہے کہ میرے حق میں حضور ﷺ کی دعا اور شفاعت کو قبول فرماویں، حدیث کے الفاظ میں صراحۃً موجود ہے: ''فشفّعه فی'' یعنی اے اللہ! تو ان کی شفاعت میرے بارے میں قبول فرما۔ تو یہاں رسول اللہ ﷺ کی دعا پر توسل ہے۔ ذات مبارک ﷺ پر تو یہاں توسل ثابت نہیں ہو سکتا۔ قائلین توسل نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ یہاں دو ہی کو نقل کیا جاتا ہے۔

www.darulfeman.com

اول اگر یہاں صرف دعا کی قبولیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے درخواست تھی یعنی صرف آپ ﷺ کی دعا کی قبولیت کے بارے میں توسل مقصود تھا تو آپ ﷺ نے اتنی لمبی دعا کیوں تعلیم فرمائی جس میں توسل بالذّات کی بھی تصریح موجود ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی تعلیم فرمایا:

((واتوجه اليك بنبيك محمد نبى الرحمة [۱]))

''اور تیری طرف تیرے نبی محمد ﷺ جو نبی رحمت ہیں کے وسیلہ سے متوجہ ہوتا ہوں۔''

پس توسل بالذات یہاں صراحۃً موجود ہے''فشفع فیّ'' سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذات بابرکت پر توسل کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی مانگی کہ: ''اے اللہ حضور ﷺ کی شفاعت ہمارے حق میں قبول فرما۔'' بہرکیف حدیث شریف میں ذات مبارک ﷺ پر توسل واضح موجود ہے دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر مراد صرف آپ ﷺ کی دعا پر توسل کرنا ہوتا تو اس حدیث شریف کے راوی عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے خود یہ دعا آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اوروں کو تعلیم نہ کی ہوتی [۲]۔ کیونکہ [۳] حدیث کا راوی حدیث شریف کا معنی اور مطلب دوسروں سے بہتر طور پر جانتا ہے۔ خصوصاً جبکہ بات بھی سیدھی سادی ہے اس میں کوئی خاص پیچیدگی نہ ہو۔ چنانچہ طبرانی معجم کبیر میں نقل کرتے ہیں

[۱] اس کے جواب میں منکرین توسل کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تیری طرف تیرے نبی ﷺ جو نبی رحمت ہیں دعا کے وسیلہ اور ذریعہ سے متوجہ ہوتا ہوں اس لیے آخر میں یوں درخواست کی کہ: ''اے اللہ! تو ان کی شفاعت اور دعا میرے حق میں قبول فرما۔

[۲] منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو بھی یہ حضرت عثمان بن حنیف کا ہی اجتہاد ہے کہ انہوں نے اس سے یہی سمجھا اور دوسروں کو اس کی تعلیم کی۔ ورنہ حدیث میں تو ''فشفعه فیّ'' کے الفاظ اس بات کی وضاحت کیلئے کافی ہیں کہ یہاں مراد اس سے یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرے کہ اے اللہ تو میرے حق میں حضور ﷺ کی شفاعت اور دعا قبول فرما۔

[۳] اور قائلین اس کے جواب میں یوں فرماتے ہیں۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

www.ahlehaq.com

کہ ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک (ضروری) کام کے سلسلہ میں آیا جایا کرتا تھا۔حضرت عثمان بن عفان خلیفہ راشد (بوجہ مصروفیت) نہ اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے۔وہ شخص حضرت عثمان بن حنیف سے ملا اور اپنی (حاجت) کی شکایت کی:

((فقال عثمان بن حنيف ايت الميضا فتوضأثم ايت المسجد فصل فيه ركعتين ثم قل اللهم انى اسئلك واتوجه اليك بنبينا محمد صلى الله عليه واله وسلم نبى الرحمة.)) (الحدیث)

''عثمان بن حنیف نے اس شخص سے کہا وضو کی جگہ جا کر وضو کر پھر مسجد میں جا کر دو رکعت نفل نماز پڑھ اور یہ دعا کر اے اللہ! تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں اپنے نبی حضرت محمد ﷺ (یعنی) نبی رحمت کے وسیلہ سے۔''

اسی طرح مذکورہ بالا حدیث کی پوری دعا ان کو بتائی اور انہوں نے اسی طرح کیا۔روایت کے آخر میں ہے کہ اس دعا کی برکت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی تعظیم وتکریم کی اور اس کا کام بھی کر دیا۔

امام طبرانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور علامہ منذری نے بھی اس روایت کو نقل کر کے طبرانی کے اس قول الحدیث صحیح کی تائید کی ہے اور امام بیہقی نے بھی اس کو دو طریق سے نقل کیا ہے۔علامہ ابوالحسن الہیثمی مجمع الزوائد میں اس حدیث شریف کو نقل کر کے اس کی صحت کا گویا اقرار کرتے ہیں [1]۔

یہ واقعہ آپ ﷺ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد کا واقعہ ہے۔اس پر نہ کسی صحابی نہ خود خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکار کیا۔جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ توسل بالنبی بعد الوفات حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بلا کسی نکیر ہوتا رہا۔

۱؎ وقال الطبرانى عقبه الحديث صحيح بعد ذكر طرقه التى روى بها.(مجمع الزوائد:۲/۲۷۹)

www.qaruleman.com

اس کا جواب منکرین توسل کی طرف سے یوں دیا جاتا ہے کہ خلیفہ ارشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس توسل کرنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے اس طرح توسل کر کے دعا مانگی ہے۔ بلکہ دعا مانگ کر حاضر ہوئے۔ انہوں نے اس کا کام کر دیا تو اس سے یہ کہاں ثابت ہے کہ اس شخص کے اسی طرح توسل یا حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کے اس توسل کی تعلیم کرنے کی اطلاع [1] امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ہوگئی ہوگی اور انھوں نے ان پر نکیر نہیں فرمائی البتہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے اس سے یہی توسل سمجھ لیا تھا اس لیے انہوں نے دوسروں کو بھی تعلیم کی۔

اسی طرح اس کے جواز اور عدم جواز پر مذاہب اربعہ کے اور دیگر متأخرین علماء نے بہت طویل بحثیں کی ہیں لیکن یہاں صرف علامہ شوکانی جو اہل حدیث (غیر مقلدین) کے امام سمجھے جاتے ہیں اور حافظ ابن تیمیہ کے معتقدین بھی ان کو حجت کہتے ہیں۔ انہی سے کچھ نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بالکل واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو آپ کی زندگی میں وسیلہ بنانا اور آپ ﷺ کے انتقال کے بعد دوسرے بزرگوں کو وسیلہ بنانا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے۔ کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا تو کسی صحابی نے بھی اس کا خلاف نہیں کیا۔ میرے خیال میں جواز توسل نبی کریم ﷺ سے مخصوص کر دینا جیسا کہ عزالدین (ابو محمد عبدالسلام) کو وہم ہوا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔ اس عدم تخصیص کی دو دلیلیں ہیں۔ پہلے تو وہی صحابہ کا اجماع جس سے ہم مطلع کر چکے

[1] یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرت مالک الدار حازن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پر یہی اعتراض نہیں ہوسکتا کیونکہ وہاں مالک الدار خود اس شخص کی آمد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی حالت بیان کر نا روایت کرتے ہیں تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ثابت ہوسکتی ہے اور ان کا نکیر نہ کرنا معنیٰ رکھتا ہے لیکن یہاں خلیفہ ارشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع کے ثبوت کے بغیر ان کے نکیر نہ کرنے کا کوئی معنیٰ اور وزن نہیں۔ واللہ اعلم

www.GaruEeman.com

ہیں اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ارباب فضل اور کمال کو بطور وسیلہ پیش کرنے کا دراصل یہ مطلب ہے کہ ان کے اعمالِ صالحہ اور کمالات کو وسیلہ بنایا ہے کیونکہ کوئی شخص وسیلہ بننے کے قابل ہی تب ہوتا ہے جبکہ وہ اعمالِ صالحہ کرے تو گویا جب کوئی شخص یوں کہے کہ اے اللہ! میں فلاں صاحبِ کمال کو تیرے دربار میں وسیلہ پیش کرتا ہوں۔ تو اس کا وسیلہ بننا بلحاظ کمال کے ہوگا اور نیک عمل کو وسیلہ بنانا حدیث سے ثابت ہے جیسا مسلم و بخاری وغیرہ میں موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان تینوں شخصوں کا قصہ بیان کیا جو غار میں تھے اور غار کے منہ پر پتھر آ گیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے بڑے عمل کو وسیلہ بنایا اور پتھر غار سے ہٹ گیا۔ تو اگر اعمالِ صالحہ سے توسل ناجائز ہوتا یا شرک ہوتا جس طرح عزالدین وغیرہ سخت گیر لوگ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان تینوں آدمیوں کی دعا قبول نہ کرتے اور نبی کریم ﷺ ان کا قصہ بیان کرنے کے بعد ان کے فعلِ توسل کو ضرور ناجائز قرار دیتے (قاضی مرحوم توسل کو ثابت کر کے اب منکرین توسل کے دلائل کا جواب دیتے ہیں) اور فرماتے ہیں کہ جب واضح ہوگیا کہ توسل جائز ہے تو اب معلوم ہوگیا کہ جو دلائل منکرین توسل پیش کرتے ہیں مثلاً:

﴿ما نعبد هم الا لِيقرِبونا اِلى اللهِ زلفى﴾ اور ﴿فلا تدعوا مع اللهِ احدا﴾ اور ﴿له دعو الحقِ ط والذِين يدعون مِن دونه لا يستجِيبون لهم بشى﴾

ہمارے دعویٰ جواز توسل بالنبی والصالحین کے لیے مضر نہیں بلکہ اگر ان آیات کو امتناع توسل کے لئے پیش کیا جائے گا تو یوں کہا جائے گا کہ محل نزع اور امتناع توسل سے یہ دلائل بالکل اجنبی ہیں کیونکہ مشرکوں کے اس قول سے کہ ﴿ما نعبد هم ....﴾ صاف واضح ہے کہ مشرک قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ جو شخص بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے وہ اس کی عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ خدا کے دربار میں اس کی عزت ہے اس کو وسیلہ بناتا ہے۔ اسی طرح یہ آیت ﴿فلا تدعوا مع الله .....﴾ جواز توسل کیخلاف نہیں کیونکہ اس میں تو صرف یوں کہا گیا ہے کہ خدا کے

www.darulemaan.com

ساتھ کسی دوسرے کو نہ پکارو اور یوں نہ کہو ''یا اللہ یا فلاں ''اور جو کسی بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے وہ صرف اللہ کو پکارتا ہے ہاں اللہ کے کسی نیک بندہ کو بوجہ کمال وسیلہ بناتا ہے جس طرح ان غار والے تین اشخاص نے اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنایا تھا اور اسی طرح یہ آیت ﴿والذین یدعون من دونہ .... ﴾ جواز توسل کے خلاف نہیں کیونکہ مشرک تو ان کو بلاتے تھے جو ان کی سنتے نہیں تھے اور خدا کو جو ان کی سنتا ہے، اس کو نہیں بلاتے ۔لیکن کسی بزرگ کو وسیلہ بنانے والا تو صرف اللہ کو بلاتا ہے کسی دوسرے کو نہیں بلاتا۔ ہمارے سابق کلام سے منکرین توسل کے تمام دلائل کی بھی قلعی کھل جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے دلائل کو منع توسل سے دور کا واسطہ نہیں ۔مثلاً ان کا یہ استدلال کہ:

﴿یوم لا تملك نفس لنفس ولامر یومئذ لله ..... ﴾ جواز توسل کے منافی نہیں ۔ کیوں کہ اس آیت میں صرف یہ بیان ہو رہا ہے کہ قیامت کو سب اختیارات اللہ کو ہوں گے اور کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہوگا۔لیکن جو شخص کسی بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے اس کا تو کبھی یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ یہ بزرگ اختیارات اخروی میں خدا کا شریک ہے جو یہ عقیدہ رکھے کہ غیر اللہ کو امر آخرت میں کچھ اختیار ہے، اس کو تو ہم بھی گمراہ سمجھتے ہیں لیکن متوسلین کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہوتا۔اسی طرح منکرین توسل کا آیت:

﴿لیس لك من الامر شیٔ﴾ اور آیت ﴿قل لا املك لنفسی نفعاو لا ضرّا ﴾ سے استدلال کرنا غلط ہے۔

کیونکہ ان آیتوں میں تو اس کی تصریح ہو رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو امر اللہ میں کوئی دخل نہیں ہوگا اور یہ کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے نفع ونقصان کے مالک نہیں تو دوسرے کے نفع ونقصان کس طرح مالک ہو سکتے ہیں۔لیکن کسی نبی، ولی یا عالم کے توسل کے عدم جواز میں ان آیتوں کا کیا دخل ۔متوسل کا تو یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ غیر اللہ کو امر آخرت یا نفع ونقصان میں کوئی اختیار ہے،توسل کا انکار نبی کریم ﷺ کی

www.qaulefaisal.com

شفاعت کا انکار ہے اور شفاعت کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مقامِ محمود یعنی مقامِ شفاعت عظمیٰ کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے اور مخلوق کو یہ ہدایت کی ہے کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس شرفِ عظیم کی درخواست کیا کریں اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا ہے کہ مقام محمود کی درخواست کیا کرو، آپ کو دیا جائے گا اور امت کی سفارش کرو تمہاری سفارش قبول ہوگی۔ ہاں شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگا۔ پھر خاص اس کو جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں۔ اسی طرح منکرین توسل کا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کہ اے فلاں بن فلاں میں تیرے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں۔ پیش کرنا جواز توسل کے خلاف نہیں کیونکہ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ جب کسی کو اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو میں اس کا خلاف نہیں کرسکتا اور یہ بات ہر انسان جانتا ہے لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ توسل ناجائز ہے کیونکہ متوسل کا یہ عقیدہ تو نہیں ہوتا کہ وسیلہ......امر اللہ میں دخل ہے۔ بلکہ اس کا تو یہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اختیار کلی صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور میں صرف اسی سے درخواست کرتا ہوں۔ ہاں کسی ایسے بزرگ کو جس کے طفیل دعا قبول ہو سفارشی بناتا ہوں اور وسیلہ پیش کرتا ہوں۔ (ترجمہ دُرّ نضید مصنفہ قاضی شوکانی)

اور یہاں یہ شبہ بھی بالکل غلط ہے کہ (معاذ اللہ) جس شخص کے ذریعہ توسل کیا جاتا ہے اس کا رتبہ یا شان اللہ تعالیٰ سے زیادہ نظر آتا ہے یا اس کا اس پر کوئی زور و جبر چل سکتا ہے۔ یہ صرف ایک وہم ہے ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جن حضرات کے وسیلہ سے دعا مانگی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نیک و مقرب بندے ہوتے ہیں اور ان سے محبت و تعلق:

﴿ان رحمة اللّٰه قريب من المحسنين﴾ ''بے شک اللہ کی رحمت محسنین سے قریب ہے۔'' کے مصداق نزولِ رحمت کا ذریعہ ہے۔ پس توسل کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں بنتی کہ اے اللہ فلاں مقبول بندہ پر جو رحمت ہے اس کے توسل سے دعا کرتا ہوں اور یہاں وہ ان الفاظ سے اپنے

پوشیدہ تعلق ومحبت کا اظہار کرتا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہوسکتا ہے نہ مذکورہ بالا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

بلکہ توسل بالاعمال جو بالا جماع جائز ہے اور توسل بالشخص میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اوران کے درمیان یہ نزاع لفظی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جوحضرات انبیاء اور صالحین کے توسل سے دعا کے قائل ہیں ان کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ ان شخصیتوں کو (العیاذ باللہ) ان کے اوصاف کمالیہ اوران کی دینی خدمات وغیرہ سے الگ کرکے توسل کرتے ہیں بلکہ ان کی دینی خدمات اور خداداد خوبیاں پیش نظر رہتی ہیں۔صالحین پران کے نیک کاموں کی برکت سے اللہ کی رحمتیں برستی ہیں۔ان کے ساتھ محبت ان کی دین کی خاطر عظیم قربانیوں کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ان حضرات کے ساتھ یہ محبت اور تعلق بذات خود ایک پوشیدہ نیک عمل ہے۔اب اس محبت کے عمل کے ساتھ آواز بھی شامل ہوجاتی ہے اوران حضرات کے توسل سے اللہ سے سوال کیا جاتا ہے۔گویا توسل بالاعمال اور توسل بالاشخاص اکٹھے ہوجاتے ہیں اور یہ مسئلہ بلانزاع جائز ہوسکتا ہے اوراس بات کے حضرت حافظ ابن تیمیہ بھی قائل ہیں چنانچہ وہ بحق فلاں کے ذریعے سوال کرنے کے مختلف اسباب بیان کرتے ہوئے تحقیق کرتے ہیں:

فیحمل قول القائل !اسئلك بنبيك محمد على انه ارادانى با يمانى به و بمحبته واتوسل اليك با يمانى به و بمحبته و نحو ذلك وقد ذكرتم ان هذا جائز بلا نزاع قيل من اراد هذا المعنى فهو فى ذالك بلا نزاع واذا حمل على هذا المعنى لكلام من توسل بالنبى صلى الله عليه وآله وسلم بعد مماته من السلف كما نقل عن بعض الصحاب والتابعين و عن الا مام احمد وغيره كان هذا حسنا و حيئنذ فلا يكون فى المسأ لة نزاع ولكن كثيرا من العوام يطلقون هذا اللفظ ولا يريدون هذا المعنى فهٰؤلآءِ الذين انكر عليهم من انكر .(ص:٦٢ قاعده جليل التوسل والوسيله)

یعنی ’’اس قول کے کہنے والے:(اے اللہ) میں تجھ سے تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتا

ہوں۔کو اس پر محمول کیا جائے کہ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ (اے اللہ) میں تجھ سے محمد ﷺ پر ایمان اور ان کے ساتھ محبت کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں اور اسی طرح اور کوئی معنی مراد لیا جائے تو آپ کو یاد ہوگا کہ یہ بلانزاع (بلاتفاق) جائز ہے [1] اور کہا گیا ہے کہ جس کا یہی مقصد ہو تو وہ بلانزاع صحیح ہے اور (اگر) اسی معنی پر ان اسلاف کو محمول کیا جائے جنہوں نے آپ ﷺ کے بعد بھی توسل کیا جیسا کہ بعض صحابہ، تابعین اور امام احمد بن حنبل سے نقل کیا گیا ہے تو یہ اچھا ہوگا اور ایسی حالت میں مسئلہ اختلافی نہیں رہتا۔لیکن بہت سے عوام اس لفظ کو مطلق بولتے ہیں اور اس سے یہی معنی مراد نہیں لیتے۔یہی لوگ ہیں جن پر انکار کرنے والوں نے انکار کیا ہے۔

پس حضرت حافظ یہاں یہ فرماتے ہیں کہ عوام یہ الفاظ ویسے ہی (بلاسمجھے بوجھے) بول دیتے ہیں اور ان کی مراد اس سے جائز معنی نہیں ہوتا۔بلاشبہ امام ابن تیمیہ نے جو کچھ فرمایا وہ کسی قدر صحیح ہے۔تاہم اس کا جواب توسل کو ماننے والے یہ دے سکتے ہیں کہ قابل غور بات یہ ہے جس شخص پر وہ توسل کرتا ہے۔اگر اس پر اس کا ایمان نہیں اور اس کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے لیے) تعلق ہی نہیں تو وہ اس پر توسل ہرگز نہیں کرے گا۔مسلیمہ کذّاب یا غلام احمد قادیانی وغیرہ دجّال و کذّاب پر کوئی مسلمان توسل نہیں کرتا اور نہ ہی عیسائی، یہودی یا کسی اور باطل فرقہ کے سربراہ پر توسل کرتا ہے۔اگرچہ وہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔باوجود پدری محبت کے وہ ہرگز اس پر توسل نہیں کرے گا۔تو یہ بات اس کی دلیل ہے کہ جب وہ دعا میں آپ ﷺ یا کسی صالح شخص پر توسل کرتا ہے تو آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کیساتھ (اللہ تعالیٰ کے لیے) تعلق ومحبت کی وجہ سے ہی کرتا ہے۔اگرچہ وہ اس پر تصریح نہیں کرتا۔تاہم ایک

---

[1] کیونکہ جیسا کہ اتباع اور اطاعت رسول اعمال ظاہر ہیں، اسی طرح آپ ﷺ پر ایمان لانا اور آپ کے ساتھ محبت وتعلق رکھنا باطنی اعمال میں سے ہے چونکہ توسل بالاعمال بالاجماع جائز ہے۔اسی لیے یہ توسل بالاجماع جائز ہوسکتا ہے۔

www.darulfeman.com

مسلمان سے ظاہر یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور ان کے ساتھ عقیدت رکھنے کے طفیل اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے اور وہ اپنے ظاہری اعمال کو نظر انداز کر کے تواضع اور عبدیت کا ثبوت دیتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار میرا کوئی عمل ایسا نہیں کہ جس کو میں آپ کی بارگاہ عالی میں پیش کر کے اس کے ذریعے سے دعا کروں۔ البتہ صرف آپ کے رسول ﷺ سے محبت و عقیدت کا تعلق ہے۔ پس اے اللہ آپ اس تعلق (جو ایک قلبی عمل ہے) کی لاج رکھتے ہوئے میری دعا کو قبول فرمایئے۔

الغرض توسل بالذات اور توسل بالاعمال میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں۔ جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے بالکل جدا کر کے پہلے کو شرک اور دوسرے کو جائز قرار دیا جائیا گر توسل بالاشخاص شرک ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعے توسل کرنا (جس سے متنازع فی توسل بھی مراد ہو سکتا ہے) اور خود آنحضرت ﷺ کا عثمان بن حنیف کی روایت میں نابینا صحابی کو ایسی دعا تلقین کرنا جس میں آپ کے ذریعے توسل کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے اور بقول خود ابن تیمیہ بعض صحابہ تابعین اور امام احمد وغیرہ کا آپ ﷺ سے توسل کرنا وغیرہ العیاذ باللہ یہ سب شرک میں داخل ہوگا۔

پھر ان روایتوں اور مثالوں سے علماء کی اکثریت نے توسل بالذات ہی مراد لیا ہے تو کیا فقہائے کرام صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور خود نبی کریم ﷺ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے العیاذ باللہ امت کی اکثریت کو شرک کے دلدل میں پھنسا دیا۔

اسی طرح سے قرآن کی آیت: ﴿وکانوا مِن قبل یستفتِحون﴾ سے بھی توسل کی یہی قسم مراد ہو سکتی ہے اور اس کی شانِ نزول میں جو دوسری روایات وارد ہوئی ہیں وہ اس کے متعارض اور مخالف نہیں اور سب اسبابِ نزول یہاں بلا کسی تکلف اور بآسانی جمع ہو سکتے ہیں۔

تو ایسی حالت میں سوچنے کی بات ہے کہ آخر اس ا توسل میں وہ کون سی خرابی ہے جس کے لئے

www.darulfeman.com

فقہاء کے اقوال، احادیث اور آثار میں دور دور کی تاویلیں کرنے کی ضرورت پڑے یا ایسی احادیث جن میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو اس کو ضعیف یا موضوع ثابت کرنے پر پوری طاقت لگا دی جائے۔

فی الحقیقت اگر ہم ایسے ہی دور کے احتمالات نکالنے لگیں تو شاید شریعت کا کوئی حکم بھی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی طرح اگر قرآن مجید کی من مانی تفسیریں شروع ہو جائیں تو نہ تو کوئی چیز ناجائز ہوگی اور نہ ہی کوئی عمل شرک سے خالی ہوگا۔

الغرض یہ متنازع فیہ توسل کوئی شرک نہیں بلکہ اس میں دعا کی قبولیت کے ساتھ اور ایک فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ اور سلف صالحین سے محبت بڑھ جاتی ہے اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مخلوق کے درمیان محبوب کے فضائل و اوصاف محبت کرنے والے میں، اس کی استعداد کے مطابق منتقل کر دیتے ہیں۔ درود شریف کے بارے میں اس آیت مبارک:

﴿اِن الله و ملئِکته یصلون علی النبی یایها الذِین امنوا صلوا علیهِ وسلّموا تسلیما﴾

کے متعدد فوائد اور اسباب میں یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ درود شریف پڑھنے سے آپ ﷺ کے ساتھ تعلق اور محبت میں اضافہ ہوگا اور یہی محبت درود شریف پڑھنے والے کو حسب استعداد، والہانہ انداز میں، آپ ﷺ کی سچی اتباع پر ڈال سکتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات امت کو سمجھائی ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔ حضور ﷺ سے:

((لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین.))

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ اور اس کی اولاد اور

[1] یعنی اس اختلافی توسل جس میں بزرگوں سے مانگنا نہیں ہوا کرتا بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے۔ البتہ دعا کی قبولیت کی امید سے (اللہ کے سامنے کسی صالح کے ساتھ اپنی قلبی محبت وعقیدت پیش کر کے) صالح شخصیت پر توسل کرتا ہے۔

www.dareeman.com

سارے لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔'' (متفق علیه مشکوٰۃ کتاب الایمان)

پس محبت بڑھانے کے لیے مختلف ذرائع ہوتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں آپ کے ساتھ ادب واحترام سے ملاقات کرنا اور آپ سے دعاں کی درخواست کرنا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ و لـو انهـم اذ ظلموا اانفسهم جآء وك فاستغفروا لله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابارّحيم o ﴾ (سورۃ النسا آیت:۶۴)

یعنی'' اگر وہ لوگ ظلم کر بیٹھتے تھے اپنی جانوں پر، حاضر ہوتے آپ کے پاس پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے (اللہ سے) مغفرت طلب کرتے تو وہ ضرور اللہ کو پاتے، بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا۔''

یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کرتے تھے اور آپ ﷺ نے بھی دعا کے لیے فرمایا ہے۔ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے عمرہ کرنے کی اجازت مانگی۔ آپ ﷺ نے اجازت بھی دی اور فرمایا:

((وقال اشركنا يا اخى فى دعا ئك ولاتنسنا))

''اے ہمارے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں شریک کرنا اور ہم کو نہ بھولنا۔

تو (حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) حضور ﷺ نے ایسا کلمہ فرمایا (ہے) جس کے بدلے میں مجھ کو تمام دنیا بھی خوش نہیں کرسکتی۔ (رواہ ابوداود والترمذی، مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

اسی طرح آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں آپ ﷺ کے آثار اور تبرکات کو دیکھنا اور ان کی حفاظت کرنا، آپ ﷺ سے محبت بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واتخِذوا مِن مقامِ اِبراهِيم مصلى ﴾

www.darulemaan.com

''اور بنالو ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے کھڑا ہونے کی جگہ کو جائے نماز۔''

مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کرتے رہے۔اس پر ان کے قدم مبارک کے نشان بھی بطور معجزہ پڑ گئے ہیں ۔(دیکھئے بخاری ج ۲ کتاب التفسیر)

اس طرح جب بنی اسرائیل کو حضرت طالوت کے بارے میں منجانب اللہ بادشاہ مقرر ہونے میں تردد ہوا تو انہوں نے اپنے پیغمبر سے کوئی ظاہری حجت طلب کی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وقال لهم نبيهم ان ايت ملكه ان يا تيكم التابوت فيهِ سكِينة مِن ربكم وبقِي مِما ترك آل موسى وآل هارون.﴾ (البقرہ:۲۴۸)

''ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس (طالوت) کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ (جو مقدس صندوق تم کھو چکے ہو) وہ صندوق تمہارے پاس (واپس) آئیگا۔اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور اس میں بچی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں چھوڑ گئے ہے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کی اولاد۔''

اللہ ہی ان آیات کے اسرار اور حکمتوں کو خوب جانتا ہے۔پھر بھی اس میں ایک حکمت یہ دکھائی دیتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آثار ونشانات دیکھ کر ان کی خداداد صفات اور کمالات اور دینی خدمات سامنے آتی ہیں ان سے تعلق اور محبت مضبوط تر ہو جاتا ہے ان کی صداقت اور حقانیت پر یقین بڑھ جاتا ہے۔

پس اس طرح آپ ﷺ کے آثار وتبرکات کو رکھا گیا اور آپ نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

(۱):۔امام نسائی طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں وفد بن کر حاضر ہوئے۔ہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ کو خبر دی کہ ہمارے علاقے میں (نصاریٰ کی) ایک عبادت گاہ ہے۔ہم نے آپ ﷺ سے آپ کے وضوء سے بچا ہوا پانی مانگا۔آپ ﷺ نے پانی منگوایا۔

www.qaruteeman.com

((فتوض وتمضض ثم صبه لنا فی ادوا ة وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانها بهذا الما واتخذوها مسجدا قلنا ان البلد بعید والحرّ شدید والما ینشف فقال مدّوه من الماء فانه لا یزیده الاطیبا.)) (رواه النسائی ،مشکوٰۃ باب المساجد)

''پس وضوء فرمایا اور منہ میں پانی ڈالا کلی کی، پھر اس کو ہمارے لیے ایک چھاگل میں ڈال دیا اور ہم کو حکم دیا کہ جا جس وقت اپنی زمین کو پہنچو۔ اپنی عبادت گاہ (بیعتہ) کو توڑ ڈالو اور اس کی جگہ پر یہی پانی چھڑکو اور اس کو مسجد بنالو۔ ہم نے عرض کیا کہ شہر دور ہے اور گرمی سخت ہے پانی خشک ہو جائے گا۔ فرمایا اس میں اور پانی ڈالو) (اس لیے کہ) وہ اس کی برکت کو زیادہ کردے گا۔''

(۲): بخاری اور مسلم میں ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ مکہ میں ابطح میں تھے۔ چمڑے کے ایک سرخ خیمے میں تشریف فرما تھے اور میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے آپ ﷺ سے بچا ہوا پانی لیا اور:

((ورایت الناس یبتدرون ذالك الوضوء فمن اصاب منه شیئا تمسح به ومن لم یصب منه اخذ من بلل ید صاحبه))(متفق علیه مشکوٰۃ باب الستر)

''میں نے لوگوں کو دیکھا، جلدی جلدی لیتے تھے اس پانی کو، جس کو مل جاتا، اپنے بدن پر مل لیتا اور جس کو نہ ملتا اپنے ساتھی کے ہاتھ سے تری لے لیتا (اور اپنے بدن پر مل لیتا)۔''

پس بعض اوقات حضور ﷺ خود اپنے آثار اور تبرکات اپنے فدائین صحابہ رضی اللہ عنہم پر تقسیم بھی کردیتے تھے۔

(۳): امام ترمذی حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ:

((دخل علی رسول الله ﷺ فشرب من فی قربة معلقة قائما فقمت الی فیها فقطعته.))(سنن ترمذی ابواب الا شربته وقالا هذا حدیث حسن غریب صحیح)

www.darulfeeman.com

''آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے آپ نے لٹکی ہوئی مشک کے منہ سے کھڑے ہوکر پانی پیا میں نے (فورا) کھڑے ہوکر مشک کا منہ (جہاں آپ ﷺ کا منہ مبارک لگا تھا) کاٹ لیا۔

(۴): بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((ان النبی صلی الله علیه وسلم اتی منی فاتی الجمرة فرماها ثم اتی منزله بمنی ونحر نسکه ثم دعا بالحلاق وناول الحالق شقه الایمن فحلقه ثم دعا ابی طلحة الانصاری فاعطاه ایاه ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقه فاعطاه ابی طلحة فقال اقسم بین الناس.))(متفق علیه مشکوۃ باب الحلق)

کہ ''نبی کریم ﷺ منیٰ آئے اور جمرہ کے پاس آکر اس پر کنکر مارے۔ پھر منیٰ میں اپنے مکان میں آئے۔ پھر سر مونڈھنے والے کو بلایا۔ اپنے سر کا دایاں حصہ اس کے آگے کیا۔ پھر ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کو وہ بال دیئے۔ پھر (سر کا) بایاں حصہ آگے کیا اور فرمایا اس کو مونڈ دو۔ وہ بال بھی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دے دیئے اور فرمایا اس کو لوگوں میں تقسیم کردو۔

(۵): مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے کسروانی طیلسان کا جبہ نکالا۔ جس کے گریبان اور چاکوں پر ریشم کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ کہنے لگیں یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا جب وہ وفات پا گئیں تو میں نے لے لیا:

((وکان النبی صلی الله علیه وسلم یلبسها ونحن نغلسها للمرضی نستشفی بها.))(رواہ مسلم ،مشکوٰۃ کتاب اللباس)

''اور نبی ﷺ اس کپڑے کو پہنا کرتے تھے اور ہم بیماروں کے لیے اس کو دھوتے ہیں اور اس کے ذریعے شفا طلب کرتے ہیں۔''

(۶): اسی طرح امام بخاری حضرت عثمان بن عبداللہ بن موہب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں

www.qurilfeman.com

کہ میرے گھر والوں نے مجھے ایک پیالہ دے کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا:

((وکان اذا اصاب الانسان عین او شئی بعث الیها مخضبته فاخرجت من شعر رسول الله صلی الله علیه وسلم وکانت تمسکه فی جلجل من فضة فخضخضته له فشرب منه قال فاطلعت فی الجلجل فرایت شعرات حمراء.))(رواه البخاری والرقی مشکوٰة کتاب الطب)

''اور جب کسی کو نظر لگ جاتی یا کوئی تکلیف ہوتی وہ بڑا پیالہ ان کے پاس بھیجتا۔ وہ (ام سلمہ) رسول اللہ ﷺ کے بال مبارک نکالتیں انہوں نے انہیں چاندی کی خول میں رکھا ہوا تھا وہ اس پیالہ میں اس کو ہلاتی پھر وہ اسے پی لیتا (عثمان بن عبداللہ) فرماتے ہیں کہ میں نے خول میں جھانک کر دیکھا اس میں چند ایک سرخ بال تھے۔''

اس قسم کے واقعات کی کافی تعداد کتب احادیث میں موجود ہے۔ اب یہاں اس کے سوا اور کیا مراد ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ سے تعلق اور محبت کے اظہار کے ذریعے، اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ ﷺ کے موئے مبارک وغیرہ کے طفیل تبرک حاصل کرتے یا اللہ تعالیٰ سے شفایابی کی امید پر اِن آثار کے ذریعے گویا عملی توسل کرتے اس حدیث شریف میں تصریح بھی موجود ہے۔

(۷): امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے اور میرے ہاں قیلولہ فرماتے تھے۔ میں آپ کے لیے چمڑے کا بچھونا بچھا دیتی۔ آپ اس پر سوتے تھے:

((وکان کثیر العرق فکانت تجمع عرقه وتجعله فی الطیب فقال النبی صلی الله علیه وسلم ما هذا فقلت عرقك نجعله فی طیبنا وهو من اطیب الطیب وفی روایته قالت یا رسول الله نرجوا برکته لصیباننا قال اصبت.))(متفق علیه)

www.dawateislami.com

”آپ ﷺ کو بہت پسینہ آتا تھا۔ میں آپ ﷺ کا پسینہ جمع کرتی تھی اور خوشبو میں ملا دیتی۔ نبی ﷺ نے فرمایا اے ام سلیم یہ کیا ہے (ام سلیم) کہنے لگیں یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اس کو خوشبو میں ملا دیتے ہیں اور یہ نہایت عمدہ خوشبو ہے ایک روایت میں یوں ہے کہ (ام سلیم نے) کہا، ہم اپنے بچوں کے لیے اس سے برکت کی امید رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے خوب کیا۔“

الغرض آپ ﷺ کے آثار دیکھنے سے آپ ﷺ کے ساتھ تعلق اور محبت میں اضافہ ہوسکتا ہے اور یہی محبت و تعلق اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ [1]

خلاصہ یہ کہ متنازع فیہ توسل عقائد میں سے نہیں جس کیلئے قطعی اور یقینی دلائل کی ضرورت ہو اور نہ اسی طرح توسل کرنا فرض یا واجب یا سنت مؤکدہ ہے تاکہ قائلین توسل سے اس کے ثبوت میں صریح اور صحیح احادیث، صحابہ کرام ﷺ کے عام معمول کا مطالبہ کیا جائے یا یوں کہا جائے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر ﷺ نے اسی طرح توسل کیوں نہ کیا یا فلاں خلیفہ ارشد یا فلاں امام نے اسی طرح توسل کیوں نہیں کیا۔ ان سوالات کی ضرورت تو اس وقت ہوتی جبکہ قائلین توسل اس کی فرضیت یا وجوب کے دعویدار ہوتے۔ لیکن جب وہ اس کی فرضیت وغیرہ کے قائل نہیں تو صرف اس کے جواز کے لیے ان سے یہ مطالبہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسی طرح توسل کرنا فقہی طور پر ایک فرعی مسئلہ ہے جو قرآن وسنت کے خلاف نہیں (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق، فاعل حقیقی، لینے اور دینے والا صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو سمجھا

---

[1] بعض قائلین توسل ان روایات سے جن سے تبرک بآثار الصالحین ثابت ہوسکتا ہے انہی روایات سے اس اختلافی توسل پر استدلال کرتے ہیں لیکن اس میں تامل کیا جا سکتا ہے البتہ ان روایات سے صالحین کے آثار پر تبرک حاصل کرنے کا جواز مثبت ہوتا ہے۔ جس طرح سلف صالحین کی سیرت ان کے اقوال وافعال ان کے کارنامے سن کر ان سے محبت بڑھتی ہے اسی طرح ان کے آثار دیکھنے سے ان کی یاد تازہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھتی ہے شاید ان کو باقی اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو۔ واللہ اعلم۔

www.urduebook.com

اور مانا جائے اور یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہی ہوگا اور اللہ جل شانہ کو منظور نہ ہو تو اس کا ہونا ناممکن اور محال ہے) اور جو کچھ قائلین، کتاب وسنت سے پیش کرتے ہیں (اگرچہ اس میں دوسری تفاسیر، تاویلات اور احتمالات کو زیادہ اہمیت اور فوقیت دی جاسکے) تاہم عدم تعارض وتقابل کی وجہ سے ان نصوص میں اسی طرح توسل کے احتمال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بعض صحابہ ﷺ کا اس پر عمل کرنا اور بہت سے جلیل القدر علماء کا اس کے جواز پر تصریح کرنا اور اس پر عمل کرنا اور ائمہ متبوعین میں سے کسی سے اس کی ممانعت صراحت سے صاف لفظوں میں منقول نہ ہونا بلکہ بعض ائمہ کے قول وفعل سے جواز معلوم ہونا یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو اس کے جواز کے لیے کافی شافی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر کوئی اس طرح توسل کئے بغیر دعا مانگے تو اس کو اللہ قبول نہیں فرمائیں گے اور نہ یہ خیال کیا جائے کہ اس طرح توسل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ لازم ہو جاتا ہے وہ اس دعا کو قبول فرمائے بلکہ اسکی حیثیت صرف جواز کی ہے جس کی وجہ سے دعا کی قبولیت کی امید کی جاتی ہے۔ اگرچہ بہتری اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ذریعہ دعا مانگی جائے یا صاف الفاظ میں اس طرح توسل کریں کہ یا اللہ میرا کوئی عمل ایسا نہیں جس کو میں آپ کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کے ذریعے سے دعا کروں البتہ آپ کے رسول ﷺ سے محبت وعقیدت ہے۔ پس اے اللہ اس تعلق اور ان پر ایمان لانے کی لاج رکھ کر میری فلاں حاجت پوری فرما۔ یا اگر ایسا نہ کہیں صرف یوں کہیں کہ اے اللہ فلاں سے جو تعلق وعقیدت ہے اس کے طفیل میرا فلاں کام پورا فرما، اگر تعلق اور عقیدت کی تصریح نہ بھی کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن نیت میں یہی ہو یا اسی طرح اور کوئی جائز معنی ہو تو اس طرح توسل بالاتفاق جائز ہوگا۔ البتہ اس طرح مطلق توسل (یعنی یوں کہنا کہ اے اللہ فلاں کے طفیل یا واسطے میرا فلاں کام پورا فرما) کرنے میں حافظ ابن تیمیہ جو یہ فرماتے ہیں کہ عوام اس کے جائز معنی مراد نہیں لیتے، یہ بات ان کی کسی قدر صحیح ہے۔ اگرچہ ایک مسلمان کی اس کے سوا اس طرح کہنے سے اور کیا مراد ہو سکتی ہے تاہم

www.darulfeeman.com

عوام اور ناواقف مسلمانوں کی حالت ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ وہ کرتے اور کہتے ہیں، ان سے بھی ہمیں واقفیت ہے۔ اس لیے عوام کو مسئلہ کی پوری نوعیت سمجھانی چاہیئے تا کہ ایمان اور عقائد کی حفاظت ہو۔ نیز اس باب میں قدرے تفصیل سے بحث کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسی متنازع فیہ توسل میں دونوں طرف یعنی قائلین اور مخالفین کے بحث مباحثے کی کافی گنجائش ہے۔ اس لیے جس طرح متنازع فیہ توسل کے نہ ماننے والوں کو گستاخ، گمراہ اور کافر کہنا ممنوع و ناجائز ہے، اسی طرح اس کے قائلین کو مشرک اور گمراہ سمجھنا ناجائز اور بہت بڑا ظلم ہے البتہ حدود سے تجاوز کرنا کہیں بھی جائز نہیں۔ اسی طرح محبت واحترام کے پردے میں مخلوق کی عبادت بھی ناجائز ہے۔ محبت اور عبادت دونوں کے حدود شریعت مطہرہ نے مقرر کئے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی بھی مخلوق کی عبادت کو حرام اور شرک قرار دیا ہے اگر چہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے کیوں نہ ہو۔ اس کے بالمقابل قابل احترام ہستیوں، انبیاء علیہم السلام وغیرہ کی تکریم و احترام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے محبت اور عبادت دونوں کے حدود اور احکام جدا جدا ہیں اور ان کو بلا امتیاز ایک دوسرے پر چسپاں کرنا سراسر ظلم اور قرآن مجید میں معنوی تحریف کے مترادف ہے اور عوام کو خواہ مخواہ افراط و تفریط میں مبتلا کرنا ہے۔

www.darulemaan.com

www.daruleeman.com

باب پنجم

شرک فی الاطاعت!

شرک فی الاطاعت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کسی کی مستقل طور پر اطاعت کی جائے یعنی اگر کسی کا حکم، حکمِ الٰہی کے خلاف بھی ہو، پھر بھی اس کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ وتبارک کا ارشاد ہے:

﴿اِتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا مِن دونِ اللہِo﴾ (پ۱۰ آیت:۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ تعالے کے بجائے اپنا پروردگار بنا رکھا ہے۔''

اس آیت شریفہ کی تفسیر صحیح ترمذی میں یوں آئی ہے کہ حضرت عدی بن حاتم فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری گردن میں سونے کی صلیب تھی آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار پھینکو اور میں نے آپ کو سورہ توبہ کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا: ﴿اِتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا مِن دونِ اللہِo﴾ ''کہ ان اہل کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کے بجائے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے (اس آیت کی تفسیر میں) فرمایا کہ یہ لوگ اپنے علماء اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اس کو حلال سمجھتے اور جب وہ ان پر کوئی چیز حرام کر دیتے تو وہ لوگ اس کو حرام قرار دیتے۔

معلوم ہوا کہ کسی کی مستقل طور پر شارع یا قانون ساز کی حیثیت سے اطاعت کرنا ناجائز اور ممنوع ہے جس طرح اہل کتاب نے حلال وحرام قرار دینے کا مکمل اختیار اپنے علماء اور راہبوں کو دے رکھا تھا۔ مگر جو اطاعت مخلوق کی ہو لیکن حکم الٰہی کے ماتحت ہی ہو، وہ اطاعت شرک یا حرام نہیں بلکہ مطلوب اور محمود ہے جیسے فقہاء امت اور ائمہ مجتہدین کی تقلید اور اطاعت۔ کیونکہ ان حضرات کا فقہ اور اجتہاد قرآن وسنت کے طابع ہوتا ہے۔ یعنی اللہ رب العزت اور نبی کریم ﷺ کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے اور یہ

www.darulemaan.com

اطاعت عین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اتباع ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کو چھوڑ کر اپنے آباواجداد کی پیروی کرنا بھی حرام اور ممنوع ہے۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿و اذا قِيل لهم اتبِعوا ما انزل الله قالوا بل نتبِع ما الفينا عليهِ اباء نا اولو كان ابائُهُم لا يعقِلون شيئا ولا يهتدون ٥﴾ (پ۲ آیت:۱۷۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے ہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں۔نہیں ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا اگر ان کے باپ دادا عقل اور ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی۔''

اس آیت مبارکہ سے جس طرح آباواجداد کی اندھی تقلید اور اتباع کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح مخلوق کی جائز اتباع اور تقلید کی شرائط کی نشان دہی بھی ہوگئی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے باپ دادوں کی مذموم تقلید کے دو سبب بیان فرمادیئے۔ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو برملا رد کر کے انہیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں۔دوسرے یہ کہ ان کے آباواجداد عقل اور ہدایت سے کورے تھے ﴿لا يعقِلون﴾ اور ﴿ ولا يهتدون ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ اگر آباواجداد اور ایک عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن وسنت کا علم ہے اور اس کو عقل یعنی درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے (کہ جو احکام قرآن وحدیث میں صراحۃً نہ ہوں، ان کو بذریعہ اجتہاد اور عقل، نصوص شرعیہ سے نکال سکتا ہے) تو ایسے عالم اور مجتہد کی تقلید اور اتباع اللہ شانہ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع اور اطاعت ہے۔

قرآن مجید ہی سے اہلِ حق ، اہلِ علم وعقل اور اہلِ رُشد و ہدایت آباء واجداد، باپ دادوں کی پیروی اور اتباع ثابت ہے جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت

کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔'' انہوں نے جواب میں عرض کیا:

﴿ نعبد اِلهك واِله ا با ئِك اِبراهِيم واِسمعِيل واِسحاق اِلها واحِدا﴾ (البقرہ:۱۳۳)

''ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے باپ دادوں کے خدا کی (یعنی ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے خدا کی) وہ خدائے وحدہ لاشریک ہے۔''

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں تقلید کی دونوں قسموں یعنی حق و باطل کی مثال موجود ہے:

﴿اِنی ترکت مِلة قوم لا یو مِنون بِا اللهِ وهم بالاخِرةِ هم کافِرون واتبعت مِلة اباءِ اِبراهِیم واسمٰعیل واِسحاق ویعقوب﴾ (سورہ یوسف:۳۸)

''میں نے اس قوم کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور میں نے پیروی کی اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی ملت اور مذہب کی۔''

اس سے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ جل شانہ اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں بے وقوف باپ دادوں کی تقلید حرام اور ممنوع ہے لیکن اگر باپ دادا علم و عقل اور رشد و ہدایت پر ہوں تو ان کی اتباع جائز اور پسندیدہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فقہاء امت اور مجتہدین جن کی بصارت وہ بصیرت، علم و تقویٰ ہر لحاظ سے ایک مسلّم حقیقت ہے، کی تقلید اور اتباع کرنا جائز و مطلوب ہے اور جو لوگ ائمہ مجتہدین کی تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کر کے شرک و کفر قرار دیتے ہیں وہ سخت غلطی اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ اس موضوع پر حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی کتاب تقلید کی شرعی حیثیت میں بہت ہی منصفانہ بحث کی ہے۔ اس باب میں حضرت کی کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

تقلید کی حقیقت!

دین کی اصل دعوت صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت و اطاعت کی طرف ہے۔ نبی کریم ﷺ کی

www.darulfeman.com

اطاعت بھی اسی لیے واجب ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اقوال وافعال سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی ترجمانی فرمائی ہے، حلال وحرام اور جائز وناجائز کو واضح فرمایا۔

قرآن وسنت میں بعض احکام اور باتیں تو ایسی ہیں جنہیں ہر ایک شخص بآسانی سمجھ لیتا، مثلاً:

﴿لا یغتب بعضکم بعضا﴾ (سورۃ الحجرات)

''تم میں سے کوئی کسی کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔''

معمولی لکھا پڑھا آدمی اور تھوڑی سی عربی جاننے والا اس آیت کے معنی جان لے گا یا مثلا حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((لا فضل لعربی علی عجمی))

یعنی ''کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔''

یا یہ ارشاد بھی بالکل آسان اور واضح ہے اور اس میں بھی کوئی پیچیدگی یا الجھن نہیں لیکن قرآن وسنت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن میں اجمال پایا جاتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسری آیت یا آنحضرت ﷺ ہی کی کسی دوسری حدیث سے متعارض نظر آتے ہیں مثلاً:

(۱): ﴿ولمطلّقٰت یتربّصن بانفسِهن ثلٰثة قروء﴾

''اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین قروء گزرنے تک انتظار کریں گی۔''

یہ مطلقہ عورت کی عدت کا بیان ہے جس کی مدت تین قروء بیان کی گئی ہے قروء کا لفظ عربی زبان میں حیض (ماہواری) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور طہر (پاکی) کے لیے بھی۔ اگر پہلا معنی لیا جائے تو یہ مطلب یہ ہوگا کہ تین مرتبہ ایام ماہواری گزر جائیں۔ اگر دوسرے معنی لیے جائیں تو تین طہر گزرنے پر عدت پوری ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس معنی کو لیا جائے؟

(۲): حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

www.urduweb.com

((من كان له امام فقر اۃ الامام له قرأة))

''جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قرات اس کے لیے بھی قرات بن جائے گی۔''

دوسری طرف آپ ﷺ ہی کا ارشاد ہے کہ:

((لا صلوا لمن یقر أبفاتحة الکتاب))

''جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوگی۔''

اب دونوں حدیثوں کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی حدیث شریف کو بنیاد بنا کر دوسری حدیث کا مطلب یوں لیا جائے کہ یہ منفرد (اکیلے نمازی) کے لیے ہے۔ یا دوسری حدیث کو اصل مان کر یوں کہیں کہ پہلی حدیث میں قرات میں مراد سورۂ الفاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورت ہے اور سورۂ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟

اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث سے احکام نکالنا کوئی آسان کام نہیں اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی سمجھ کو رہنما بنا کر اس قسم کے احکام میں فیصلے کرنے لگیں اور دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف اور بزرگوں نے ان آیات واحادیث کا کیا مطلب لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا طریقہ نہایت خطرناک ہے اور دوسرا طریقہ بہت محتاط ہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم وفہم، تقوی و پرہیزگاری، دین ودیانت، ذکاوت وحافظہ کے لحاظ سے ہم لوگ قرونِ اولی کے علماء کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے پھر وہ لوگ قرآن وسنت کو ہم سے بہتر بھی سمجھتے تھے کیونکہ نزولِ قرآن زمانے کے قریب تھے اور اس زمانے کی معاشرت، طرزِ گفتگو، قرآن وحدیث کے صحیح پسِ منظر اور نزول کے ماحول سے مکمل واقف تھے۔ اب اگر ہم اپنی سمجھ پر اعتماد کرنے کی بجائے قرآن سنت کے احکام میں اس مطلب ومفہوم کو اختیار کرلیں جو ہماری اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے تو یوں کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔

www.alruleman.com

تقلید کی ضرورت!

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تقلید کی ضرورت وہاں پیش آئے گی جہاں قرآن وسنت کے کسی حکم کو ہم ٹھیک طرح نہ سمجھ سکیں۔ خواہ اس بنا پر کہ کسی عبارت کے ایک سے زیادہ معنیٰ نکل سکتے ہوں یا اس میں تفصیل مذکور نہ ہو یا اس کے متعارض دلیل موجود ہو۔ قطعی احکام جن کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہو، میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مشہور حنفی عالم علامہ عبدالغنی نابسی فرماتے ہیں:

فالا مر متفق عليه المعلوم من الدين بالضرور لا يحتاج الى التقليد فيه لا حد الا كفرضية الصلوٰة والصوم والزكوٰة والحج ونحوها وحرمة الزنا واللواط وشرب الخمر والقتل والرق والغصب وما اشبه ذلك والامر المختلف فيه هوالذى يحتاج الى التقليد فيه. ـه ١

''پس وہ متفقہ مسائل جن کا دین میں ہونا بداہۃً معلوم ہے۔ ان میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ کی فرضیت اور زنا لواطت، شراب نوشی، قتل، چوری، غصب وغیرہ کا حرام ہونا۔ دراصل تقلید کی ضرورت ان مسائل میں پڑتی ہے جن میں علماء کا اختلاف ہو۔''

اسی طرح علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واما الا حكام الشرعى فضربان احدهما يعلم ضرورة من دين الرسول صلى الله عليه وسلم كا لصلوٰة الخمس والزكوٰة وصوم شهر رمضان والحج و تحريم الزنا وشرب الخمر وما اشبه ذلك فهذا الا يجوز التقليد فيه لان الناس كلهم يشتركون فى ادراكه والعلم به فلا معنى للتقليدفيه وضرب آخر لا يعلم الا با لنظر والا ستدلال كفروع

ـه ١ خلاصته التحقيق فى حكم التقليد والتلفيق ص ٤ مطبوعه مكتبته اليشيق. استنبول

www.darulreman.com

العبادات والمعاملات والفروج والمناكحات وغير ذلك من الاحكام فهذايسوغ فيه التقليد بدليل قول الله تعالىٰ فاسئلو اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ولانّا لو منعنا التقليد فى هذه المسائل التى هى من فروع الدين لا حتاج كل احدان ان يتعلم ذلك و فى ايجاب ذلك قطع عن المعايش و هلاك الحرث والماشية فوجب ان يسقط. [1]

''اورشرعی احکام کی دوقسمیں ہیں۔ایک وہ احکام ہیں جن کا جزو دین ہونا بداہتہً ثابت ہے مثلاً پانچ نمازیں، زکوۃ، رمضان کے روزے، حج، زنا اور شراب کی حرمت اور اسی جیسے دوسرے احکام، تو اس قسم میں تقلید جائز نہیں۔کیونکہ ان چیزوں کا علم تمام لوگوں کو ہوتا ہے۔لہٰذا اس میں تقلید کے کوئی معنی نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس کا علم فکر ونظر اور استدلال کے بغیر نہیں ہوسکتا، جیسے عبادات، معاملات اور شادی بیاہ کے فروعی مسائل۔اس قسم میں تقلید درست ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فاسئلو ااهل الذكر ﴾

''یعنی اہل ذکر (علماء) سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے ہو۔''

نیز اس لیے کہ اگر ہم دین کے ان فروعی مسائل میں تقلید کو ممنوع کر دیں تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص با قاعدہ علوم دین کی تحصیل میں لگ جائے اور لوگوں پر اس (تعلیم) کو واجب کرنے سے زندگی کی تمام ضرویات برباد ہو جائیں گی اور کھیتوں اور مویشیوں کی تباہی لازم آئے گی لہٰذا ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا۔''

کیا تقلید شرک ہے؟

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تقلید کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ امام یا مجتہد کو بذات خود واجب الاطاعت سمجھ کر اس کا اتباع کیا جا رہا ہے۔ بلکہ مقصود تو قرآن وسنت کی پیروی

[1] الفقيه والمتفقه للخطيب بغدادى ج٢ ص٦٧-٦٨ ، مطبوعه دارالافتا سعوديه رياض ١٣٨٩ ھ

ہے لیکن امام کی تشریح وتعبیر پر اعتماد کیا جارہا ہے وہ قرآن وسنت کا شارح (تشریح کرنے والا) ہے۔ شارع (شریعت یا قانون بنانیوالا) ہرگز نہیں مقلد اپنے امام کو ماخذ شریعت نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرتا ہے کہ امام چونکہ قرآن وسنت کے علوم میں پوری بصیرت رکھتا ہے اس لیے اس کی تشریح زیادہ قابل اعتماد ہے۔

اب ذرا انصاف کی نظر سے دیکھ کر بتائیے کہ اس میں شرک یا گناہ کی کون سی بات ہے؟ اگر امام کو شارع (قانون ساز) یا بذات خود واجب الاطاعت مانا جائے تو بلا شبہ یہ شرک ہے۔

دیکھئے فی الحال پاکستان میں جو قانون نافذ ہے وہ کتابی شکل میں مرتب اور مدون ہے۔ کروڑوں کی آبادی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو قانون کو کتابوں سے پڑھ پڑھ کر عمل کرتے ہیں؟ اچھے خاصے انگریزی دان بھی وکیل سے مشورہ لیتے ہیں۔ خود قانون کی کتاب براہ راست سمجھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے وکلاء کو حاکم یا قانون ساز تسلیم کرلیا ہے۔

بس اس طرح قرآن وسنت کے احکام کو ٹھیک طرح سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے ائمہ مجتہدین پر اعتماد کرنے کو تقلید کہتے ہیں۔

تقلید کا ثبوت آیاتِ قرآن سے!

تقلید کی حقیقت کے بارے میں قرآنِ کریم میں اصولی ہدایات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(ا): ﴿یآ ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم﴾ (سورۃ النساء:۵۹)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے آپ میں سے اولوالامر کی اطاعت کرو۔“

﴿اولی الامرِ﴾ سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک مسلمان حکام ہیں اور حضرت جابر بن

www.darulemaan.com

عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مجاہد، حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت عطا بن السائب، حضرت حسن بصریؒ، حضرت ابوالعالیہ اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اس کا مطلب علماء اور فقہاء لیا ہے اور امام رازی نے اسے ترجیح دی ہے اور علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امرأ کی اطاعت کا نتیجہ بھی بالآخر علماء ہی کی اطاعت ہے کیونکہ امرأ بھی شرعی معاملات میں علماء کی اطاعت کے پابند ہیں۔

بہرحال اس آیت مبارک میں مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کریں اور ان علماء اور فقہاء کی اطاعت کریں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کی تشریح کرنے والے ہیں۔ اسی اطاعت کو اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔ آگے اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿فاِن تنازعتم فِی شیء فردو ہ اِلی اللہِ والرسولِ اِن کنتم تو مِنون بِا اللہِ والیومِ الآخِر﴾ (سورۃ النساء:۵۹)

پس اگر کسی معاملے میں تمہارا باہم اختلاف ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف لوٹا دو۔ اگر اللہ اور اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس جملہ میں مجتہدین کو خطاب کیا گیا ہے اور امام ابوبکر جصاصؒ ﴿اولی الامرِ﴾ کا مطلب علماء لیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

و قولہ تعالیٰ عقیب ذلك فاِن تنازعتم فِی شیء فردوہ اِلی اللہِ والرسولِ یدل ان اولِی الامرِ ھم الفقھاء لانہ امر سائرالناس بطاعتھم ثم قال فاِن تنازعتم......فامر اولی الامر برد المتنازع فیہ الی سن نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ کانت العامۃ ومن لیس من اھل العلم لیست ھذہ منزلتھم لانھم لا یعرفون کیفیۃ الردالی کتاب اللہ والسن وجوہ دلائلھا علی احکام.الحوادث فثبت انہ خطاب للعلماء.(احکام القرآن ج ص ۳۰۷)

”اور ﴿اولی الامرِ﴾ کی اطاعت کا حکم کے فوراً بعد اللہ عالی کا یہ فرمانا کہ اگر کسی معاملے میں

تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو۔اس بات کی دلیل ہے کہ اولولامر سے مراد فقہاء ہیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا اور پھر ﴿فـاِن تـنـازعتم ﴾ فرما کر اولولامر کو حکم دیا کہ جس معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہوا اسے اللہ کی کتاب اور نبی کریم ﷺ کی سنت کی طرف لوٹا دو یہ حکم فقہاء ہی کو ہوسکتا ہے کیونکہ عوام الناس اور غیر اہل کا یہ مقام نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے اللہ کی کتاب اور سنت کی طرف کسی معاملے کو لوٹانے کا کیا طریقہ ہے اور نہ انہیں نت نئے مسائل اخذ کرنے کے لیے دلائل کے طریقوں کا علم ہوتا ہے لہٰذا ثابت ہو گیا کہ یہ خطاب علماء کو ہے۔''

مشہور اہل حدیث عالم علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ ﴿فـاِن تنازعتم﴾ کا خطاب مجتہدین کو ہے۔

والظاهر انه خطاب مستقل مستانف موجّه للمجتهدين. (تفسیر فتح البیان ج ۲ ص ۳۰۸ مطبعۃ العاہمہ قاہرہ)

''اور ظاہر ہے یہ مستقل خطاب ہے جس میں حکم کا رخ مجتہدین کی طرف ہے۔''

پس معلوم ہوا کہ جن میں اجتہاد کی اہلیت نہیں مختلف فیہ مسائل میں ان کو براہِ راست قرآن وحدیث سے رجوع کر کے خود فیصلہ کرنا درست نہیں، عام لوگوں کو خطاب ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ﴿اولی الامرِ ﴾ یعنی فقہاء سے مسائل پوچھیں اور ان پر عمل کریں، جب کہ دوسرے جملہ میں مجتہدین کو خطاب ہے کہ تنازعہ کی صورت میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کر کے اپنی اجتہادی بصیرت کے ذریعہ احکام اخذ کریں لہٰذا پہلے جملہ میں عام مؤمنین کو تقلید کا حکم ہے اور دوسرے جملہ میں متبحّر علماء کو اجتہاد کا۔

(۲): قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿واِذا جـاء هـم امر مِن الامنِ اوِالخوفِ اذاعوبِه ط ولو

www.ahlehaq.org

ردوہ اِلی الرسولِ و اِلیٰ اولی الامرِ مِنھم لعلمہ الّذِین یستنبِطونہ مِنھُم﴾(نساء:۸۳)

''اور جب ان (عوام الناس) کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اس کی اشاعت کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اس معاملے کو رسول کی طرف یا اپنے ''اولوالامر'' کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو لوگ اس کے استنباط کے اہل ہیں وہ اس کی (حقیقت) کو خوب معلوم کر لیتے۔''

اس آیت سے یہ اصولی ہدایت ملتی ہے کہ جو لوگ گہری نظر اور تحقیق کی قابلیت نہیں رکھتے انہیں اہل استنباط (فقہاء مجتہدین) کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور وہ اپنی بصیرت سے جو راہِ عمل متعین کریں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اسی کا نام تقلید ہے، چنانچہ امام رازی اسی آیت کی کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

فثبت ان الا ستنباط حجة، والقیاس امااستنباط اوداخل فیه فوجب ان یکون حجة اذا ثبت ھذا فنقول:الآیة دال علی امور احدھا ان فی الاحکام حوادث مالایعرف باالنص بل بالاستنباط و ثا نیھا ان الا ستنباط حجة، و ثا لثھا ان العامی یجب علیه تقلید العلماء فی احکام الحوادث . (تفسیر کبیر ج۳ص۲۷۲)

''پس ثابت ہوا کہ استنباط حجت ہے اور قیاس یا تو خود استنباط ہے یا استنباط میں داخل ہے لہٰذا وہ بھی حجت ہوا۔ جب یہ بات طے ہوگئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت چند امور کی دلیل ہے ایک یہ کہ نت نئے پیش آنیوالے مسائل میں بعض امور ایسے ہوتے ہیں جو آیات سے (صاف طور پر) معلوم نہیں ہوتے بلکہ ان کا حکم معلوم کرنے کے لیے استنباط کی ضرورت پڑتی ہے دوسرے یہ کہ استنباط حجت ہے اور تیسرے یہ کہ عام آدمی پر واجب ہے کہ وہ پیش آنے والے مسائل واحکام کے بارے میں علماء کی تقلید کرے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ آیت جنگ کے مخصوص حالات کے بارے میں ہے۔

امام رازیؒ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

www.urduman.com

ان قوله واِذا جآ هم اِمر مِن الامنِ اوِ الخوفِ ، عام فی كل ما يتعلق بالحروب و فيها يتعلق بسا ئرالوقائع الشرعية . لان الامن والخوف حاصل فی كل ما يتعلق بباب التكليف فثبت انه ليس فی الاية ما يوجب تخصيصها با مر الحروب. (تفسیر کبیر ج۳ص۲۷۲)

''اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:''جب ان کے سامنے امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے...'' بالکل عام ہے جس میں جنگ کے حالات بھی داخل ہیں اور تمام شرعی مسائل بھی۔ اس لیے کہ امن وخوف ایسی چیزیں ہیں کہ شریعت کے فرض کردہ احکام کا کوئی باب ان سے باہر نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اسے صرف جنگ کے حالات سے مخصوص کردے۔''

اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں:

فی الآية اشار الی جواز القياس وان من العلم ...... ما يدرك بالاستنباط. (فتح البیان ج۲ص۳۳۰)

''اس آیت میں قیاس کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بعض علم ایسے ہیں جن کا ادراک (حاصل کرنا) استنباط کا ذریعہ ہوتا ہے۔

(۳): ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فلولا نفرمِن كلِ فِر قة مِنهم طآئِفة لِيتفقهوا فی الدِينِ ولِينذِروا قومهم اِذا رجعوا اِليهِم لعلهم يحذرون ﴾ (سورۃ التوبہ:۱۲۲)

''پس کیوں نہ نکل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ (سمجھ) حاصل کریں اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہوشیار کریں۔ شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں۔''

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ علم حاصل کرنے والی جماعت پر یہ واجب ہے کہ وہ دوسروں کو

www.urdueman.com

شریعت کے احکام سے باخبر کرے اور دوسروں پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے ان کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کریں۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ اس پر امام بصاص گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فوجب الحذر بانذارهم والزم المنذرين قبول قولهم. ـ ۱

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں پر واجب کیا ہے کہ جب علماء ان کو (احکام شریعت بتا کر) ہوشیار کریں تو وہ (اللہ تعالیٰ نافرمانی) سے بچیں اور علماء کی بات مانیں۔''

(۴): اللہ پاک کا ارشاد ہے:

﴿فاسئلو اهل الذِكرِ اِن كنتم لا تعلمون﴾

''اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔''

اس آیت شریفہ میں یہ اصول بتلایا گیا ہے کہ جو عالم نہ ہوں وہ علم وفن کے ماہرین سے پوچھ لیا کریں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

اما من يسوغ له التقليد فهو العامى الذى لا يعرف طرق الاحكام الشرعية فيجوزله ان يقلد عالما و يعمل بقوله قال اللهُ تعالىٰ:﴿ فا سئلوا اهل الذِكرِ اِن كنتم لا تعلمون﴾ ۲ ـ

''رہا یہ مسئلہ کہ تقلید کس لیے جائز ہے سو یہ وہ عامی شخص ہے جو احکام شرعیہ کے طریقے نہیں جانتا۔''

پس اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿ فا سئلوا اهل الذِكرِ اِن كنتم لا تعلمون﴾

۱ ـ احكام القرآن لجصاص ج۲ ص۲٦۲ ـ ۲ ـ الفقيه والمتفقه للخطيب بغدادى ج ۲ ص٦٨ مطبوعه دارالافتاء سعوديه رياض۱۳۸۹ ھ ـ

www.darulemaan.com

خطیب بغدادیؒ نے اپنی سند سے حضرت عمرو بن قیس کا قول نقل کیا ہے کہ: ''آیاتِ بالا میں اہل الذکر سے مراد اہل علم ہیں۔''

تقلید کا ثبوت حدیث شریف سے!

قرآن کریم کے علاوہ حدیث شریف سے بھی تقلید کا جواز ثابت ہوتا ہے:

(۱):((عن حذیفه قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم انی لا ادری ما بقائی فیکم فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ ۱)) (رواه الترمذی وابن ماجه و احمد)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنا عرصہ تمہارے درمیان رہوں گا۔ پس تم میرے بعد دو شخصوں کی اقتدا کرنا ایک ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور دوسرے عمر (رضی اللہ عنہ)۔''

حدیث شریف میں لفظ اقتداء آیا ہے جو دینی امور میں کسی کی پیروی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

عربی لغت کے مشہور عالم ابن منظور لکھتے ہیں:

القدو ۃوالقِدۃو ما تسننت به.

یعنی ''قدوۃ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی سنت پر تم عمل کرو اور القدوۃ الاسوۃ قدوۃ کے معنی ہیں اسوۃ (یعنی نمونہ) قرآن میں لفظ دینی امور میں انبیا علیہم السلام اور صلحاء کی پیروی کے لیے آیا ہے:

﴿ اولٰئك الذین هدی الله فبهدا هم اقتدِه﴾ (سورۃ انعام: ۹۰)

''یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے پس تم ان کی ہدایت کی اقتداء کرو۔''

پس مندرجہ بالا حدیث شریف میں لفظ اقتداء استعمال کیا گیا ہے جو دینی امور میں کسی کی پیروی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے اور اسی کا نام تقلید ہے۔

۱ مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۵۴۹ باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ۔

www.darulehsan.com

(۲): حضرت ابو ہریرہ ﷜ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((من افتی بغیر علم کان اثمه علی من افتاہ))

''جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دے گا اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔''

اس حدیث شریف سے صاف ظاہر ہے کہ تقلید جائز ہے اور عالم کے فتویٰ پر، دلیل کی تحقیق کے بغیر عمل جائز ہے۔ کیونکہ سارا گناہ بے علم کو ہوگا جو فتوی دے۔ اگر فتویٰ کی تحقیق کے بغیر عمل جائز نہ ہوتا تو سوال کرنے والے کو بھی اس بات کا گناہ ہونا چاہئے تھا کہ اس نے فتویٰ کی صحت کی تحقیق کیوں نہیں کی۔ پس حدیث شریف سے واضح ہو گیا کہ جو شخص خود عالم نہ ہو اس کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ جو شخص اس کی معلومات کے مطابق قرآن وسنت کا علم رکھتا ہو مسئلہ پوچھ لے۔ اگر وہ غلط بتائے تو گناہ عالم پر ہوگا پوچھنے والے پر نہیں۔

(۳): حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذریؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

((یحمل هذاالعلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتأویل الجاهلین)) (رواہ البھیقی فی المدخل ۱)

''ہر آنے والی نسل کے ثقہ لوگ اس علمِ دین کے حامل ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف کو باطل پرستوں کے جھوٹے دعوں کو اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے۔''

اس حدیث شریف میں جاہلوں کی تاویلات کی مذمت کی گئی اور بتایا گیا کہ ان تاویلات کی تردید علماء کا فرض ہے اور تاویلات بھی وہی آدمی کرسکتا ہے جو علم دین اور عربی کی شد بد رکھتا ہو، لیکن ایسے شخص کو بھی حدیث میں جاہل قرار دیا گیا اس کی تاویل کی مذمت کی گئی۔ پس جو لوگ مجتہدانہ بصیرت نہیں رکھتے انہیں قرآن وحدیث کے صحیح مطلب کو سمجھنے کے لیے اہل علم کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

۱ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی ص ۳۸۔

www.Qurani-Haq.com

صحابہ کرام ﷺ کے زمانے میں تقلید!

صحابہ ﷺ کے زمانے میں تقلید پر بکثرت عمل ہوتا رہا ہے جو صحابہ ﷺ تحصیلِ علم میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتے تھے وہ فقہاء صحابہ ﷺ سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے اور صحابہ کرام ﷺ سے تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی دونوں ثابت ہیں ان روایات جن سے تقلید کا ثبوت ملتا ہے سے قبل تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی کے فرق کو سمجھ لینا چاہیے۔

تقلیدِ مطلق!

اگر ایک مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک لیا جائے اور دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کر لی جائے تو اس کو تقلیدِ مطلق یا تقلیدِ عام یا تقلیدِ غیر شخصی کہیں گے۔

تقلیدِ شخصی!

اگر تقلید کے لیے کسی ایک مجتہد عالم کو اختیار کیا جائے اور ہر مسئلہ میں اسی کے فیصلہ کو لیا جائے تو اسے تقلیدِ شخصی کہتے ہیں۔ پہلے تو صحابہ ﷺ کے دور میں تقلیدِ مطلق کی مثالیں آتی ہیں:

(۱):((عن ابن عباسؓ قال خطب عمر بن الخطاب الناس بالجابية وقال يا ايها الناس من ارادان يسئل عن القرآن فليأ تى ابى بن كعب ومن ارادان يسئل عن الفرائض فليأتى زيد بن ثابت ومن ارادان يسال عن الفقه فليأتى معاذ بن جبل ومن ارادان يسل عن المال فليأتنى فان الله جعلنى له واليا وقاسما.))(رواه الطبرانى فى الاوسط)

''حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ﷺ نے جابیہ کے مقام پر خطبہ دیا اور فرمایا اے

www.tarleeman.com

لوگو! جو شخص قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہو وہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس جائے جو میراث کے احکام پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو شخص فقہ کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آ جائے اس لیے کہ اللہ نے مجھے اس کا والی اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں لوگوں کو تفسیر، فرائض اور فقہ کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ماہر اور ممتاز صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی کہ لوگ ان کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کریں، یہی تقلید ہے۔

(۲):((عن عبدالرحمن قال سلت محمد بن سیرین عن دخول الحمام ، فقال :کان عمر بن خطاب یکرھه)) [۱]

''عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن سیرینؒ سے پوچھا کہ (غسل کے لیے) حمام میں داخل ہونا جائز ہے۔انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے مکروہ کہتے تھے۔''

دیکھئے یہاں محمد بن سیرینؒ نے صرف اتنا کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے مکروہ کہتے تھے۔اس کی کوئی دلیل نہیں بتائی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی جو حضرات خود کو اہل اجتہاد یا اہل استنباط نہیں سمجھتے تھے۔وہ فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھتے وقت دلائل کی تحقیق نہیں فرماتے تھے، بلکہ اعتماد کر کے مسائل پر عمل کرتے تھے۔

(۳):((عن سلیمان بن یساران اباایوب الانصاری خرج حاجا حتی اذا کان بالنازیة من طریق مکه اضل رواحله وانه قدم علی عمربن الخطاب یوم النحر وذکرذالك له فقال عمر بن الخطاب اصنع ما یصنع المعتمر ،ثم قد علت فاذا ادرکك

[۱] اخرجہ مسدد (المطاب العالیہ للحافظ ابن حجر: ج ا ص ۵۱ حدیث نمبر ۱۸۷)

الحج قابلا فاحجج واهد ما استيسر من الهدى))ے۱

''حضرت سلیمان بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ حج کے ارادے سے نکلے جب مکہ مکرمہ کے راستہ میں نازیہ کے مقام تک پہنچے تو ان کی سواریاں گم ہوگئیں اور وہ یوم النحر ذی الحجہ میں (جب حج ہو چکا تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو ان سے یہ واقعہ ذکر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم وہ ارکان ادا کرو جو عمرہ والا ادا کرتا ہے (یعنی طواف اور سعی) اس طرح تمہارا احرام کھل جائیگا۔ پھر اگلے سال جب حج کا زمانہ آئے تو وہ دوبارہ حج کرو اور جو قربانی میسر ہو ذبح کرو۔''

اس مثال میں بھی نہ حضرت ابوایوب نے مسئلے کی دلیل پوچھی نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتائی۔ انہوں نے فقط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم و فہم پر یقین کر کے عمل فرمایا، اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

(۴): ((عن مصعب بن سعد كان ابى اذصلى فى المسجد تجوز واتم الركوع والسجود والصلوة ، قلت ياابتاه اذا صليت فى المسجد جوزت واذا صليت فى البيت اطلت ؟ قال يا بنى انا ائمة يقتدى بنا.))(رواه الطبرانى فى الكبير ورجاله رجال الصحيح)ے۲

حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے والد (سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ) جب مسجد میں نماز پڑھتے تو رکوع اور سجدہ تو پورا کر لیتے مگر اختصار سے کام لیتے اور جب گھر میں نماز پڑھتے تو رکوع وسجدہ اور نماز (کے دوسرے ارکان) طویل فرماتے۔ میں نے عرض کیا ابا جان! آپ جب مسجد میں نماز پڑھتے ہیں تو اختصار سے کام لیتے ہیں اور جب گھر میں پڑھتے ہیں تو طویل نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بیٹے! ہم (لوگوں کے) امام ہیں۔ لوگ ہماری اقتدا کرتے ہیں (یعنی لوگ

ےا موطا امام مالك ص ۱٤۹ هدى من فات الحج ۔

۲ے مجمع الزوائد للهيثمى: ج۱ ص۸۲ باب الاقتدأ بالسلف ۔

www.Ourpaigham.com

ہمیں طویل نماز پڑھتے دیکھیں گے اتنی لمبی نماز پڑھنا ضروری سمجھیں گے اور جا و بے جا اس کی پابندی شروع کر دیں گے)۔''

پس ثابت ہوا کہ عام لوگ بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو دیکھ کر ان کی تقلید کرتے تھے، اس لیے وہ اپنے عمل میں اتنی باریک باتوں کا خیال رکھتے تھے۔

(۵):((ان عمر بن الخطاب رأى على طلحة بن عبيدالله ثوبا مصبوغا وهو محرم فقال عمر : ماهذا الثوب المصبوغ يا طلحة ؟ فقال طلحة بن عبيد الله يا امير المؤمنين انما هومدر ، فقال عمر انكم ايهاالرهط ائمة يقتدى بكم الناس فلوان رجلاجاهلا راى هذاالثواب ، لقال ان طلحة بن عبيدالله قد كان يلبس الثياب المصبغ فى الاحرام فلا تلبسوا ايهاالرهط شيئا من هذه الثياب المصبغة ۔ [۱]))

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے احرام کی حالت میں کپڑا رنگا ہوا پہن رکھا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا طلحہ (رضی اللہ عنہ)! یہ رنگ کیسا؟ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا امیر المومنین یہ تو گیرو ہے (جس میں خوشبو نہیں ہوتی اور بغیر خوشبو کے رنگین کپڑا پہننا جائز ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آپ لوگ امام و مقتداء ہیں لوگ آپ کی اقتداء کرتے ہیں لہٰذا اگر کوئی ناواقف آدمی (آپ کے جسم پر) یہ کپڑا دیکھے گا تو وہ یہ کہے گا کہ طلحہ بن عبیداللہ (رضی اللہ عنہ) احرام کی حالت میں رنگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے (لہٰذا ہر قسم کے رنگین کپڑے پہننا جائز ہے چنانچہ وہ خوشبو والے رنگین کپڑے بھی پہننے لگیں گے) لہٰذا آپ حضرات اس قسم کے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنا کریں۔''

(۶): حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ بھیجا اور اہلِ کوفہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

---

[۱] مسند احمد : ۱۹۲/۱ احادیث عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ۔

www.urduelearn.com

((انی قد بعثت الیکم بعمار بن یاسر امیرا ، و عبد الله بن مسعودمعلما ووزیرا وهما من الخیارِ من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم من اهل بدرفاقتدوا بهما واسمعوا من قولهما.))

''میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے اور یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے شریف صحابہ میں سے ہیں اور اہل بدر میں سے ہیں۔ پس تم ان کی اقتدا کرو اور ان کی بات سنو۔''

(۷): حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قضا کے اصول بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

((فمن عرض له منکم قضاً بعد الیوم فلیقض بما فی کتاب الله۔ فان جاء ہ امر لیس فی کتاب الله فلیقض بما قضیٰ به نبیه صلی الله علیه وسلم فان جاء ہ امر لیس فی کتاب الله ولا قضیٰ به نبیه صلی الله علیه وسلم فلیقض بما قضیٰ به الصا لحون ، فان جاء ہ امر لیس فی کتاب ولا قضیٰ به نبیه صلی الله علیه وسلم ولا قضیٰ به الصلحون فلیجتهد رأیه.[۱]))

''آج کے بعد جس شخص کو قضا کا معاملہ پیش آئے اسے چاہیئے کہ وہ کتاب اللہ سے فیصلہ کرے پھر اگر اس کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو نبی کریم ﷺ نے جو فیصلہ فرمایا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ پھر اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جو کتاب اللہ نہ ہو اور نہ اس میں نبی کریم ﷺ کا کوئی فیصلہ ہو تو صالحین نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر ایسا معاملہ پیش آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور نہ صالحین نے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔''

[۱] سنن النسائی: ۲/ ۳۰۵ کتاب الادب الاقضیہ الحکم باتفاق اہل العلم۔ وسنن الدرامی: ۱/ ۵۴ مقدمہ۔

www.urdueman.com

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کی تشریح میں صالحین کا اتباع ضروری ہے۔ یہی تقلید کا مقصد ومطلب ہے۔ پھر یہ حدیث قاضی اور عالم کو ہدایت کرتی ہے ہ وہ اپنی اجتہادی رائے پر صالحین اسلاف کے فیصلے کی طرف رجوع کرے۔

یہ چند مثالیں سرسری طور پر بیان کردی گئی ہیں ورنہ کتب آثار ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ اس کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں شخصی تقلید کی مثالیں بھی ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں تقلیدِ شخصی!

(۱):۔صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((ان اهـل الـمدينه سلوا ابن عباس رضى الله عنهما من امرأة طافت ثم حاضت ، قال لهم تنفر قالوالاناخذ بقولك وندع قول زيد .))

''بعض اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایسی عورت کے بارے میں سوال کیا جو طوافِ فرض کے بعد حائضہ ہوگئی ہو (کہ وہ طوافِ وداع کے لیے پاک ہونے تک انتظار کرے گی یا طوافِ وداع اس سے ساقط ہو جائے گا؟ اور بغیر طواف کیے واپس آنا جائز ہوگا؟) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ (طوافِ وداع کیے بغیر) جاسکتی ہے۔اہلِ مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کو چھوڑ کر عمل نہیں کریں گے۔''

یہی واقعہ مسند ابوداود میں منقول ہے۔اس میں اہلِ مدینہ کے یہ الفاظ منقول ہیں: اے ابن عباس (رضی اللہ عنہ)! جس معاملے میں آپ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی مخالفت کر رہے ہیں اس میں ہم آپ کی اتباع نہیں کریں گے۔اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (مدینہ پہنچ کر) ام سلیمؓ سے پوچھ لینا (کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے)۔[۱]

[۱] مسند ابوداود الطیالسی: ۲۲۹ مرویات ام سلیمؓ۔

www.darulehsan.com

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مدینہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تقلید شخصی کرتے تھے اور انہی کے قول کو حجت سمجھتے تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اہل مدینہ کو ہرگز یہ نہیں کہا تم لوگ ایک شخص کو تقلید کے لیے مقرر کر کے شرک اور گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے ام سلیمؓ سے پوچھا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے عرض کیا تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حدیث کی تحقیق کر کے اپنے فتوی سے رجوع کیا اور اس کی اطلاع ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی دی جیسے مسلم، نسائی اور بیہقی وغیرہ کی روایات میں وضاحت آئی ہے۔ ؎۱

اگر اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر اہلِ مدینہ مقلد ہوتے تو ام سلیمؓ سے تحقیق کیونکر کرتے۔ یہ بات دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ کسی مجتہد کی تقلید کے بعد احادیث کی تحقیق حرام ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تقلید کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جو شخص قرآن وسنت کا مطلب سمجھے، ظاہری تعارض کو دور کرنے اور ناسخ ومنسوخ کا فیصلہ کرنے کی قابلیت خود میں نہیں پاتا وہ کسی مجتہد عالم سے تفصیلی دلائل کا مطالبہ کئے بغیر اس کے علم پر بھروسہ کر کے اس کے فتویٰ پر عمل کر لیتا ہے۔ قرآن وحدیث کا مطالعہ اور تحقیق تقلید کے بعد بند نہیں ہو جاتا۔ اس کا ثبوت تفسیریں اور شرحیں ہیں جو مقلدین نے لکھی ہیں۔

جامع ترمذی اور سنن ابوداود وغیرہ میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث منقول ہے:

((عن معاذ بن جبل ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لما بعثه الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء ؟ قال اقضی بکتاب الله قال فان لم تجد فی کتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فان لم تجد فی سنة رسول الله ولا فی کتاب الله؟ قال اجتهد رای ولا الو، فضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم صدره فقال الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله صلی الله علیه وسلم لما یرضی رسول الله. ۲؎))

؎۱ فتح الباری: ۳/ ۴۶۸، ۵۶۹ ۔ ؎۲ سنن ابی داود، کتاب الاقضیہ باب اجتہاد الرای فی القضاء اس حدیث پر امام جوزقانی نے جو اعتراضات کئے ہیں۔ علامہ ابن القیم نے اس کا جواب بھی دیا ہے اور بتایا ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

www.danreema.com

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ جب کوئی قضیہ تمہارے سامنے پیش آئے گا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ اور سنت دونوں میں نہ ملے؟ عرض کیا اس وقت اپنی رائے سے اجتہاد واستنباط کروں گا اور حق تک پہنچنے کی کوشش میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے (فرطِ مسرت سے) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینے پر اپنا دست مبارک مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے اس نے اللہ کے رسول کے اس قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

سوچنے کی بات ہے آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف ایک بڑے فقیہ صحابی کو چنا اور ان کو معلم، قاضی اور مجتہد بنا کر اہلِ یمن پر لازم کر دیا کہ وہ ان کی اتباع کریں۔ آپ ﷺ نے ان کو قرآن وسنت، قیاس واجتہاد کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت بھی دے دی۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے اہلِ یمن کو تقلیدِ شخصی کا پابند بنا دیا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ معلم ومفتی کے طور پر یمن گئے تھے، صرف ایک حکمران کے طور پر نہیں۔ ثبوت میں حدیث شریف دیکھئے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

((عن الاسود بن يزيد قال اتانا معاذ بن جبل باليمن معلما واميرا فسئلناه عن رجل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۷) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے جن اصحاب سے یہ حدیث مروی ہے ان میں کوئی بھی متہم، کذاب یا مجروح نہیں ہے۔ دوسرے انہوں نے خطیب بغدادیؒ کے حوالہ سے اسی حدیث کا ایک دوسرا طریق عبادہ بن نسی عبدالرحمٰن بن غنم عن معاذ رضی اللہ عنہ بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے۔ وہذا اسناد متصل ورجالہ معرفون بالثقہ۔ نیز بتلایا ہے کہ یہ حدیث تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی قابل استدلال ہے۔ (دیکھئے اعلام الموقعین: ۱/ ۱۷۵، ۱۷۶)

www.darulemaan.com

توفی وترك ابنته و اخته فاعطی الا بن النصف والاخت النصف.ـ۱))

''حضرت اسود بن یزیدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہمارے پاس یمن آئے وہ ہمارے امیر بھی تھے اور معلم بھی تھے۔ہم نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص نے وفات کے بعد اپنی بیٹی اور بہن چھوڑی ہے (ان کو کیا میراث ملے گی) تو حضرت معاذ بن جبلؓ نے بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف میراث دی۔''

یہاں اگر چہ معاذؓ نے فتویٰ دے کر اس کی دلیل بھی نہیں بتائی، لیکن ان کا فیصلہ تقلیداً قبول کیا گیا۔

اسی طرح مسند احمد اور معجم طبرانی میں روایت ہے کہ حضرت معاذؓ یمن تشریف لائے تو خولان کی ایک عورت آئی اور سلام کے بعد کہنے لگی کہ اے شخص! تمہیں کس نے بھیجا ہے۔حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے۔عورت نے کہا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے اور آپ اللہ کے رسول ﷺ کے ایلچی ہیں تو اے رسول اللہ ﷺ کے پیامبر کیا آپ مجھے دین کی باتیں نہیں بتائیں گے؟ حضرت معاذؓ نے فرمایا مجھ سے جو چاہو پوچھو۔ ۲

پس حضرت معاذؓ حضور ﷺ کے سفیر اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے احکامِ دین بتایا کرتے تھے۔اسی حدیث میں حضرت معاذؓ نے عورت خاوند کے حقوق بتائے، لیکن نہ کوئی آیت اور نہ کوئی حدیث سنائی۔ بلکہ اصول اسلام کے مطابق جواب دیا۔اور لوگ ان کی تقلید کرتے تھے۔صرف اہلِ یمن نہیں بلکہ دوسرے صحابہؓ بھی ان کی تقلید کرتے تھے۔چنانچہ ابومسلم خولانی کی روایت میں ہے کہ اہلِ دمشق کی ایک مسجد میں ایک حلقہ میں ادھیڑ عمر کے صحابہ کرامؓ موجود تھے۔ درمیان میں ایک جوان سرمگیں آنکھوں والے اور چمکدار دانت والے صحابی تھے۔جب صحابہؓ میں

۱ صحیح بخاری:۲/ ۹۹۷ کتاب الفرائض باب میراث البنات۔

۲ الہیثمی فی مجمع الزوائد:۴/ ۳۰۷،۳۰۸، باب حق الزوج علی المرأۃ

www.qurieman.com

کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو وہ فیصلہ اسی جوان صحابی رضی اللہ عنہ سے کراتے۔خولانی نے اپنے ہم نشین سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ چند مثالیں تقلید شخصی کی نظیر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں (تقلیدِ شخصی اور غیر شخصی) پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن،سنت سے براہِ راست احکام نکالنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اصل کے اعتبار سے اس کے لیے تقلید کی دونوں قسمیں جائز اور درست ہیں۔چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدّث دہلوی فرماتے ہیں۔

اور (تقلید کی مذمت میں جو باتیں کہی گئی ہیں) ان کا اطلاق اس شخص پر نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے قول کو حجت نہیں مانتا اور جس کا اعتقاد یہ ہے کہ حلال صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کر دیا اور حرام صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کر دیا لیکن چونکہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا علم نہیں ہے نہ وہ آپ کے کلام میں سے متعارض احادیث کی تطبیق کے طریقے سے واقف ہے اور نہ آپ کے کلام سے استنباط احکام کے طریقے جانتا ہے۔اس لیے وہ کسی ہدایت یافتہ عالم کی اس بنا پر اتباع کر لیتا ہے کہ یہ عالم (اپنے علم وتقوی کے پیش نظر) اپنے اقوال میں صائب (درست) ہوگا اور ظاہری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا متبع ہوگا۔چنانچہ اگر اس کا یہ گمان غلط ثابت ہو جائے تو وہ کسی جدال واصرار کے بغیر اس کی تقلید سے دستبردار ہو جائے گا تو (اس قسم کی) تقلید سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے۔جبکہ فتویٰ پوچھنے اور فتوی دینے کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آتا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ انسان ہمیشہ ایک ہی شخص سے فتویٰ پوچھا کرے (جسے تقلیدِ شخصی کہتے ہیں) یا کبھی ایک شخص سے اور کبھی دوسرے شخص سے پوچھا کرے (جسے تقلیدِ مطلق کہتے ہیں) جبکہ اس میں مذکورہ بالا شرائط جمع ہوں۔ [1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ: ۱۵۶ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۳۹۵ھ وعقد الجید: ۳۹، ۱۳۴۴ھ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

www.quranurdu.com

پس فی الحقیقت تقلیدِ شخصی ہو یا مطلق اصلاً جائز ہے۔

تقلیدِ شخصی کی وجہ!

اب علماء وفقہاء نے لوگوں کو صرف تقلید شخصی پر عمل کرنے کے لیے کیوں فتویٰ دیا؟

فقہاء کرام نے محسوس کیا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جارہے ہیں۔ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ کھلا رہا تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ایک شخص کا سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔وہ اپنی سستی کی وجہ سے اس وقت امام شافعیؒ کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا پھر اگر اس نے کسی عورت کو چھولیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا،لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک برقرار رہا۔اب اس کی تن آسانی اس کو ابوحنیفہؒ کی تقلید پر ڈالے گی۔غرض جس امام کے قول میں اسے فائدہ اور آرام نظر آئے گا اسے لے لے گا اور جہاں کسی کے قول میں نقصان یا خواہش نفس کی قربانی دکھائی دے اسے چھوڑ دے گا۔جس سے احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیں گے۔یہ چیز بلا اختلاف حرام ہے۔اس چیز کی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

امام احمد وغیرہ نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض اپنی خواہشاتِ نفس کے زیرِ اثر ایک چیز کو پہلے حرام یا واجب سمجھے اور پھر اسی کو جائز یا حرام قرار دیدے۔مثلا وہ خود کسی کا پڑوسی ہو اور شفعہ کا دعویٰ کرنا چاہتا ہو تو (امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق) یہ مذہب اختیار کرلے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو ہوتا ہے پھر جب کوئی دوسرا شخص پڑوس کی وجہ سے اس پر شفعہ کا دعویٰ کرے تو (امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق) یہ قول اختیار کرلے کہ شفعہ کا پڑوسی کو نہیں ہے یا مثلاً ایک شخص کسی مرنے والے کا بھائی ہو اور میت کا دادا بھی موجود ہو تو یہ مذہب اختیار کرلے کہ بھائی میراث میں دادا کے شریک ہوتے

www.darulemaan.com

ہیں اور جب خود دادا بنے اور اس کا پوتا اپنے بھائی کو چھوڑ کر مر جائے تو یہ مذہب اختیار کر لے کہ دادا کی موجودگی میں بھائی وارث نہیں ہوں گے۔ ۱

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے زمانے میں چونکہ خوف خدا اور فکرِ آخرت کا غلبہ تھا۔ اس لیے اس وقت تقلید مطلق میں کوئی برائی نہیں سمجھی گئی۔ اب چونکہ دیانت ختم اور نفسانیت کا غلبہ ہے۔ اس لیے علماء نے انتظامی مصلحت کی بنا پر یہ فتویٰ دیا کہ اب صرف تقلیدِ شخصی جائز ہے اور آزاد تقلید (یعنی تقلیدِ مطلق) کا طریقہ ترک کر دینا چاہیئے۔ اگر ہر شخص کو اختیار ہو کہ جس مسئلے میں چاہے جس مجتہد کی تقلید کر لے تو مذکورہ بالا مثالوں کی طرح ایسے اقوال کا ایک مجموعہ تیار ہو جائے گا جو کہ شیطان اور نفس کا مذہب ہو گا دین کا خواہشات کے تابع ہونا کس کے ہاں جائز نہیں ہے بلکہ فقہائے کرام تو اتنے محتاط تھے کہ وہ اپنے امام کے غیر مشہور اقوال پر فتویٰ نہیں دیتے تھے کہ لوگوں میں تقویٰ کی کمی ہے اور مختلف مذاہب سے آسانیاں تلاش کر کے ان پر عمل کی خواہش رکھتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

تمام شہروں میں تقلید ان ائمہ اربعہ میں محصور ہو گئی۔ دوسرے ائمہ کے مقلدین ختم ہو گئے اور لوگوں نے (ان ائمہ سے) اختلاف کا دروازہ بند کر دیا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علوم کی اصطلاحات پیچیدہ ہو کر پھیل گئی تھیں اور اسکی وجہ سے اجتہاد کے مرتبے تک پہنچنا سخت مشکل ہو گیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اجتہاد نااہلوں کے قبضے میں نہ چلا جائے اور ایسے لوگ اسے استعمال نہ کرنے لگیں جن کی رائے اور دین پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا علماء نے اجتہاد سے عجز کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو ان ائمہ اربعہ کی تقلیدِ شخصی کی طرف لوٹا دیا اور اس بات کو ممنوع کر دیا کہ ان ائمہ کی بدل بدل کر تقلید کی جائے۔ کیونکہ یہ طریقہ دین کے کھلونا بن جانے کا سبب ہو جاتا ہے۔ ۲

---

۱ الفتاوی الکبریٰ لابن تیمیہ: ۲/ ۲۳۷ مطبوعہ دار الکتب الحدیثہ۔ ۲ مقدمہ ابن خلدون: ۴۴۸ مطبوعہ مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر۔ کتاب نمبر ۱ باب ۶ فصل ۷۔

www.darulemaan.com

اور شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:

بلاشبہ یہ چار مذاہب جو مدون ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں۔ ان کی تقلید کے جائز ہونے کا تمام امت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحب رائے اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے لگا ہے۔[۱]

تقلیدِ شخصی کی ایک بڑی مثال!

تقلید شخصی کی ایک واضح مثال عہد عثمانی ﷺ میں جمع قرآن کا واقعہ ہے۔ حضرت عثمان ﷺ نے باجماع صحابہ ﷺ قرآن کے سات[۲] لغات یا سات حروف میں سے صرف ایک حرف کو مخصوص کیا۔ اگرچہ ساتوں حروف قرآن ہی کے تھے اور جبرئیل امین کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن مجید عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریفِ قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہ ﷺ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت یا حرف میں قرآن لکھا اور پڑھا جائے۔ انہوں نے اسی ایک حرف کے مطابق بہت سے نسخے لکھوا کر اطرافِ عالم میں بھجوائے اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی دوسرے حروف حق نہیں تھے بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن کی خاطر ایک لغت کو اختیار کیا گیا[۳] اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں اور تقلید شخصی بدعت نہیں کیونکہ عثمان ﷺ کا واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر امت کو کسی معاملہ میں کئی امور کا اختیار ملا ہو تو زمانے کے فساد کے پیش نظر ان میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کر کے باقی

---

[۱] حجة الله البالغه: ۱/ ۱۵٤ باب حكايه اهل الناس قبل الما ته الرابعة وبعدها۔

[۲] اس مسئلے کی پوری تحقیق حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب علوم القرآن میں ملے گی۔

[۳] تفسیر معارف القرآن: ۵/ ۳۳۵ مع تفسیر یسیر

www.tanzeeman.com

طریقوں کو چھوڑ سکتی ہے اور تقلید شخصی کے معاملہ میں اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

ائمہ اربعہ کی خصوصیت!

اب سوال یہ ہے کہ مجتہدین تو بہت سے گزرے ہیں مثلاً سفیان ثوری، امام اوزاعی، عبداللہ بن مبارک، اسحاق بن راھویہ، امام بخاری، ابن ابی لیلی، ابن شبرمہ حسن بن صالح وغیرہ وغیرہ، پھر ان چار اماموں کی کیا خصوصیت ہے، کسی بھی مجتہد کو تقلید کے لیے مقرر کر سکتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان حضرات کی تقلید نہ کرنے کی وجہ ایک مجبوری ہے اور وہ یہ کہ ان کے مذاہب مدون شکل میں محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر ان حضرات کے مذاہب بھی ائمہ اربعہ کے مذاہب کی طرح مدون ومرتب ہوتے تو بلاشبہ ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لیے اختیار کیا جا سکتا تھا۔لیکن نہ تو ان حضرات کے مذاہب کی مفصل کتابیں مدون ہیں نہ ان کے مذاہب کے علماء پائے جاتے ہیں۔اس لیے ان کی تقلید ناممکن بن گئی ہے۔اگرچہ صحیح اعتقاد یہی ہے کہ یہ سب حضرات ائمہ ہدایت پر ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس موضوع پر طویل بحثیں کی ہیں۔جن کا خلاصہ یہ ہے:

(ا): شریعت کو سمجھنے کے لیے اسلاف پر اعتماد کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن سلف کے اقوال پر اعتماد اس وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ صحیح اور مشہور کتابوں میں مدون ہوں یا صحیح سند کے ساتھ ہم تک پہنچے ہوں۔ نیز بعد کے علماء نے ان کی تشریح وتوضیح کی خدمت کی ہو۔اگر ان اقوال میں کئی معنی کا احتمال ہو تو ان پر بحث کر کے راجح معنی کو معین ومقرر کیا گیا ہو۔بعض مرتبہ کسی فقیہ کا قول بظاہر عام ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی خاص صورت مراد ہوتی ہے اسی لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مذہب کے علماء نے ایسی صورتوں کو واضح کر دیا ہو اور اس کے احکام کی علتیں بھی بتادی ہوں جب تک کسی مجتہد کے مذہب کے بارے میں ایسا کام نہ ہوا ہو، اس پر اعتماد کرنا درست نہیں اور یہ صفات ہمارے زمانے میں مذاہبِ اربعہ کے سوا کسی مذہب میں نہیں پائی جاتیں۔

(۲): نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اتبعوا السواد الاعظم))

یعنی ''سوادِاعظم (علماء کی جماعت کثیر) کی پیروی کرو۔''

جب ان چار مذاہب کے سوا دوسرے برحق مذاہب نابود ہوگئے تو اب انہی چار مذاہب کا اتباع سوادِاعظم ہے۔

(۳):اگر مذاہب اربعہ سے باہر بھی کسی مجتہد کے قول پر فتویٰ دینے کی اجازت ہوجائے تو خواہشاتِ نفس سے مغلوب علماء سوا اپنے کسی بھی فتویٰ کو سلف کے کسی مشہور عالم کی طرف منسوب کردیں گے کہ یہ بات فلاں امام کے فلاں قول سے ثابت ہے۔جس امام کے اقوال کی تشریح میں علماء حق کی ایک کثیر تعداد مصروف رہتی ہے اس کے مذہب پر عمل کرنے میں تو خطرہ نہیں۔لیکن جہاں یہ بات نہ ہو بلکہ کسی مجتہد کے اِکا دکا اقوال ملتے ہوں وہاں گمراہی کا سخت اندیشہ ہے(کیونکہ لوگ اس مجتہد کی بات کو غلط معنی پہنا کر اس سے من مانے نتائج نکالیں گے)۔[1]

ایک عجیب اعتراض کا مدلل جواب!

بعض حضرات نے اس بات پر کہ تقلید شخصی سے خواہش پرستی کا دروازہ بند کرنا ہے پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:''پاکستان میں اکثریت حضرات احناف کی ہے اور جتنے رقص وسرور کے کلب موجود ہیں ان کے منتظم حنفی حضرات ہیں۔اگر تقلید شخصی ہوا پرستیوں کا علاج ہے تو آج ہوا پرستیوں کے یہ معمل جابجا کیوں موجود ہیں؟''

اس کے جواب میں ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی کھلی نافرمانی کا عزم کرلیا ہے اور گناہ کو گناہ سمجھنے کے باوجود خواہش پرستی کی وجہ سے اس کا

[1] عقد الجید :۳۱،۳۳۔

مرتکب ہورہا ہے۔ اس کا علاج نہ تقلید میں ہے اور نہ ترکِ تقلید میں۔ یہاں یہ خواہش پرستی زیرِ بحث نہیں بلکہ یہاں گفتگو اس سنگین خواہش پرستی کی ہورہی ہے جس نے آج سود، شراب، قمار، بے پردگی اور دنیا بھر کے منکرات کو شرعی طور پر قرآن وسنت سے حلال ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے۔

آج پورا عالمِ اسلام اس تجدد اور اباحیت پسندی کی لپیٹ میں ہے جس نے اجتہاد اور آزادی فکر کے نام پر دین کو ختم کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ یہ لوگ قرآن وحدیث کے حوالوں سے مضامین لکھتے ہیں اور حرام و ناجائز کو حلال اور جائز ثابت کرنے کے لیے علمی ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ یہ سب حضرات تقلید شخصی کو حرام قرار دے کر ہی آگے بڑھے ہیں۔ ان کا پہلا وار اس تقلید پر ہوا ہے جس نے اس قسم کے اجتہادات کا راستہ روک رکھا تھا اور ان کو سب سے زیادہ مدد اسی پروپیگنڈے سے ملی ہے کہ ائمہ کی تقلید حرام اور شرک ہے اور اسلام نے تقلید کی بجائے آزادی فکر کا درس دیا ہے۔ ان صاحبوں نے ہمارے ان اسلاف کی دور بین نگاہوں کی پوری پوری تصدیق کر دی ہے جنہوں نے نفس پرستی کے سدِ باب کے لیے تقلیدِ شخصی کو لازم کیا تھا۔ جب تک عالم اسلام میں تقلیدِ شخصی کا رواج تھا اس وقت تک دین کے قطعی احکام اور مسلمہ مسائل کبھی ملحدین کی تحریف کا نشانہ نہیں بنے تھے لیکن جب سے یہ پروپیگنڈہ شروع ہوا ہے کہ تقلید حرام وشرک ہے تو اجتہاد کے نام سے ہر شخص نے قرآن سنت پر مشق ستم شروع کی ہے اور اس پروپیگنڈے کے بعد سے لے کر آج تک جتنے گمراہ اور ملحد فرقے سامنے آئے ہیں ان میں سے اکثر نے اپنی مشق کا آغاز اس خودرائی اور ترک تقلید سے کیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات غیر مقلد علماء کو بھی محسوس ہوئی ہے۔ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم جناب مولانا قاضی عبدالواحد خانپوری اس خودرائی پر غصہ ہو کر تحریر کرتے ہیں۔ پس اس زمانے کے جھوٹے اہل حدیث مبتعین مخالف سلف صالحین جو حقیقتِ ماجا الرسول سے جاہل ہیں وہ صفت میں وارث اور خلیفہ ہوئے ہیں۔ شیعہ اور روافض کے یعنی جس طرح

شیعہ پہلے زمانوں میں باب و دہلیز کفر ونفاق کے تھے اور مدخل (دروازہ) ملاحدہ اور زنادقہ کے تھے اسلام کی طرف اسی طرح یہ جاہل بدعتی اہلِ حدیث اس زمانے میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں۔ ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے مثل اہل تشیع کے الی ان قال۔ مقصود یہ کہ رافضیوں میں ملاحدہ تشیع ظاہر کر کے حضرت علی اور حسنین رضی اللہ عنہم کو غلو کے ساتھ تعریف کر کے، سلف کو ظالم کہہ کر گالی دے دیں اور پھر جس قدر الحاد وزندقہ پھیلائیں کچھ پرواہ نہیں۔ اسی طرح ان جہال بدعتی کاذب اہل حدیثوں میں ایک دفعہ رفع یدین کرے، تقلید کا رد کرے اور سلف کی ہتک کرے مثل ابوحنیفہؒ کی۔ جن کی امامت فی الفقہ اجماع امت سے ثابت ہے اور پھر جس قدر کفر اعتقادی اور الحاد اور زندیقیت ان میں پھیلا دے بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں اور ایک ذرہ چین بچین بھی نہیں ہوتے۔ اگر چہ علماء اور فقہاء اہلسنت ہزار دفعہ ان کو متنبہ کریں ہرگز نہیں سنتے۔ سبحان اللہ تعالیٰ ماشبہ اللیلۃ بالبارحۃ اور سر (راز) اس کا یہ کہ وہ مذہب وعقائد اہل سنت والجماعت سے نکل کر اتباع سلف سے مستنکف (یعنی سلف کو حقیر سمجھ کر ان کی اتباع سے روگردانی کرنے والے) ومتکبر ہوگئے ہیں۔ فافهم وتدبر الی ان قال۔ پھر ملاحدہ ومرزائیہ قادیانیہ نکلے تو انہوں نے بھی انہی کے باب اور دہلیز اور مدخل سے ہونا اختیار کیا اور جماعت کثیرہ کو ایمان سے مرتد اور منافق بنایا اور جب زنادقہ چکڑالویہ نکلے تو بھی انہی کے دہلیز ودروازہ سے داخل ہوئے اور ایک خلق کو ان سے مرتد بنایا اور جب یہ.....خاتمۃ الملحدین نکلا تو بھی انہی جہال اہل حدیث کے باب اور دہلیز سے داخل ہو کر کیا جو کچھ کیا یعنی پہلے اس نے سدِ متین اور حصن حصینِ اسلام کہ اجماعِ امت مرحومہ اور اتباع سلف صالحین ہے کہ خیر القرون ہیں اس کو توڑا۔ پھر اسلام میں کفر ونفاق کو داخل کیا اور تحریفِ کلام الٰہی وقرآن مجید کی۔ مذاہب ملاحدہ زنادقہ کی طرح ایسی کی کہ یہودیوں سے بھی بڑھ گیا اور الحادِ جہمیہ اور نیچریہ اور کفریات فلاسفہ دہریہ کو اسلام میں بذریعہ مکروفریب اور تحریف کے داخل کیا......بلفظہ (کتاب التوحید والسنّت فی رداہل الحاد والبدعۃ:۲۶۲،۲۶۳)

اسی طرح مشہور غیر مقلد عالم مولانا محمد حسن بٹالوی اپنے پچیس سالہ تجربے کے بعد فرماتے ہیں کہ پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق (ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں) اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر وارتداد کے اسباب اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر دینداروں کے بے دین ہوجانے کے لیے بے علمی کیساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔ اگر وہ اہلحدیث میں جو بے علم یا کم علم ہو کر ترکِ مطلق تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں۔ اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہوجاتے ہیں۔ (اشاعۃ السنۃ نمبر ۴ جلد اول)

تقلید کے درجات!

تقلید کی حقیقت اور تقلیدِ شخصی کا ضروری ہونا تو ثابت ہو چکا۔ اب ایک ضروری بات یہ ہے کہ فقہاء نے تقلید کرنے والوں کے کچھ درجات کی تشریح کی ہے۔

(ا): پہلا درجہ عوام کی تقلید کا ہے عربی زبان نہ جاننے والے، اسلامی علوم سے بالکل ناواقف، خواہ دوسرے علوم وفنون میں بہت ماہر اور تعلیم یافتہ ہوں۔

(۲): ایسے لوگ جو عربی جانتے ہوں اور عربی کی کتابیں پڑھ سکتے ہوں لیکن تفسیر حدیث وفقہ وغیرہ علوم باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھے ہوں۔

(۳): ایسے حضرات جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں لیکن علومِ دین کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت سے عاری ہوں۔ یہ سب لوگ عوام میں داخل ہیں اس قسم کے لوگوں کے لیے تقلیدِ محض کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ براہِ راست کتاب وسنت کو نہیں سمجھتے اور نہ احکام کے دلائل میں تطبیق وترجیح کا فیصلہ کر سکتے ہیں تو وہ کسی امام کا دامن ضرور پکڑیں گے۔

(ب): دوسرا درجہ متبحر عالم کی تقلید کا ہے۔ ایسا آدمی جو کہ درجہ اجتہاد تک نہ پہنچا ہوا گرچہ اسلامی علوم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے عرصہ دراز تک ان کی درس وتدریس اور تصنیف کی خدمت میں

www.darulfeman.com

فقہاء کے زیرِ نگرانی مشغول رہا ہو۔ اس قسم کا عالم مذہب کے دلائل سے بھی واقف ہوتا ہے اور بحیثیت مفتی اپنے مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے اور حرف کے مطابق، کسی ایک قول کو اختیار کرنے یا مذہب کی تشریح کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

(ج): تیسرا درجہ مجتہد فی المذہب کی تقلید ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو استدلال اور استنباط کے بنیادی اصولوں میں کسی مجتہدِ مطلق کے پیرو ہوتے ہیں۔ لیکن جزوی مسائل کو براہِ راست قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اخذ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ایسے حضرات اپنے امام سے فروعی احکام میں اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن اصولاً وہ مقلد ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً فقہ حنفی میں امام ابو یوسف اور امام محمد [۱]، فقہ شافعی میں امام مزنی اور امام ابوثور۔ فقہ مالکی میں ابن القاسم اور فقہ حنبلی میں ابراہیم الحربی وغیرہ۔

(د): آخری درجہ مجتہدِ مطلق کا ہے۔ وہ شخص جس میں تمام شرائطِ اجتہاد پائی جاتی ہوں وہ اپنے علم وفہم کے ذریعے اصول استدلال بھی خود قرآن وسنت سے اخذ کرنے پر قادر ہو اور ان اصول کے تحت تمام احکامِ شریعت قرآنِ کریم سے مستنبط بھی کرسکتا ہو جیسے امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ وغیرہ۔ یہ حضرات اگرچہ اصول وفروع دونوں میں مجتہد ہوئے ہیں لیکن ایک طرح کی تقلید ان کو بھی کرنی پڑتی ہے۔ جن مسائل میں قرآن وسنت میں کوئی تصریح نہیں ہوتی وہاں یہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قیاس اور خالصتہً اپنی رائے کے بجائے صحابہ یا تابعین کے کسی قول کی تقلید کریں۔ بہرکیف جس طرح عام آدمی

---

[۱] بعض علماء کے نزدیک امام ابو یوسف وامام محمد وامام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ اجتہادِ مطلق کے منصب پر فائز ہیں انہوں نے اصول میں بھی اپنے استاذ سے اختلاف کیا۔ چونکہ قواعد اور اصول بہ نسبت فروع وجزیات کے قلیل ہیں۔ اس لیے اصول میں اختلاف اتنا نمایاں نہ ہوسکا جتنا کہ فروع میں ہوا تقریباً ان حضرات کا اختلاف حضرت امام سے ایسا ہے جیسا کہ خود امام کا اختلاف اپنے استاد حضرت حمادؒ یا ان کے استاد حضرت ابراہیم نخعیؒ سے ہے جیسا کہ بعض اہل تحقیق نے ذکر کیا۔

www.alruhman.com

اپنے ملک کا قانون براہِ راست نہیں سمجھ سکتا اور کسی ماہر قانون کا مشورہ لیتا ہے اس طرح عام لوگوں کو اپنے امام کی تقلید ضروری ہے اگر چہ وہ بظاہر کہیں کسی حدیث کو فقہ سے متعارض پائیں کیونکہ وہ احادیث کی تطبیق کو نہیں سمجھتے۔

تقلیدِ جامد کی مذمت!

ایک ضروری بات یہ ہے کہ شریعت کے احکام میں خود رائی اور تقلید کی مخالفت قبیح ہے اس طرح تقلید میں جمود اور مبالغہ بھی برا ہے اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً ائمہ مجتہدین کو (نعوذ باللہ) شارع یا انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم سمجھنا۔

(۲): کسی صحیح حدیث پر صرف اس لیے عمل نہ کرنا کہ اس بارے میں ہمارے امامؒ سے کوئی حکم ثابت نہیں۔[۱]

(۳): کسی متبحر عالم کو یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ امام کا قول صحیح حدیث کے خلاف ہے اور حدیث کے مقابل کوئی دلیل نہیں۔ پھر بھی حدیث کو قابلِ عمل نہ سمجھنا یہ بھی تقلیدِ جامد میں شامل ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ امام کا قول حدیث کے خلاف ہے اور اس پر اس سے بڑھ کر قوی دلیل موجود نہیں بڑا دشوار امر ہے اور یہی منزلتہ الاقدام میں سے ہے خصوصا آج کل جبکہ نفسانی خواہشات کا زور ہے اور اکثر لوگ دین سے متعلق چند اردو رسالے پڑھ کر یا زیادہ سے زیادہ قرآن حدیث کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کر اپنے آپ کو اس بات کا حقدار سمجھنے لگ گئے اور مسائل میں مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کر کے

---

[۱] مثلاً تشہد میں اشھد ان لا الہ الا اللہ کہتے ہیں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا بہت سی احادیث سے ثابت ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سنت سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ امام ابوحنیفہؒ سے اس کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں (یہ بعض لوگوں کے زعم کے مطابق لکھا گیا ورنہ اس مسئلے میں امام اعظمؒ کا قول موجود ہے دیکھئے) (رفع التردد فی عقد الاصابع عند التشہد للعلامتہ ابن عابدینؒ)

اس صحیح حدیث کے مصداق بن گئے ہیں کہ:

((ضلو واضلو))

"وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کرام کو جزائے خیر دے کہ انہوں اس کے لیے بھی چند معقول شرائط مقرر کی ہیں۔ تاکہ دین نفس پرستوں کے ہاتھوں کھلونہ بن کر نہ رہ جائے وہ شرائط یہ ہیں:

(ا): وہ عالم ایسا شخص ہو جو اگرچہ رتبہ اجتہاد تک نہیں پہنچا ہو لیکن اسلامی علوم کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرنے کے بعد علوم کی تدریس و تصنیف کی خدمت میں اکابر علماء کی زیر نگرانی عرصہ دراز تک مشغول رہا ہو۔ تفسیر، حدیث، فقہ ان کے اصول سے مستحضر ہوں اور کسی کی تحقیق میں اسلاف کے افادات سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہو اور ان کے طرز تصنیف و استدلال سے مزاج شناس ہونے کی بنا پر ان کی صحیح مراد تک پہنچ سکتا ہو۔[۱]

(ب): جس حدیث کی بنا پر وہ امام کا قول ترک کر رہا ہو اس کے بارے میں یہ اطمنان ہو کہ وہ علماء حدیث کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ بعض اوقات کسی حدیث کی تصحیح میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے جو حضرات اسے صحیح سمجھتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں اور جو حضرات اسے ضعیف سمجھتے ہیں اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر مجتہد نے اس حدیث کو چھوڑا تو ضعیف قرار دے کر چھوڑا ہے۔

(ج): اس حدیث کے معارض کوئی آیت قرآنی یا کوئی دوسری حدیث موجود نہ ہو۔

(د): اس حدیث کا مطلب بالکل صاف اور واضح ہو اور اس کا کوئی دوسرا اطمینان بخش مطلب نہ نکل سکتا ہو کیونکہ بسا اوقات ایک حدیث میں کئی معنی کا احتمال ہوتا ہے۔ مجتہد اپنی بصیرت اجتہاد سے

---

[۱] ایسا عالم مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے عرف کے مطابق ایک قول کو اختیار کرے یا مذہب کی تشریح کرنے کا اہل ہوتا ہے نیز جن مسائل کی تصریح کتب مذہب میں نہیں ہے ان کا جواب مذہب کے اصول و قواعد سے نکالنے کا جواز بھی اس کو حاصل ہے۔

www.urdumaza.com

اس کے ایک معنی کو متعین کر دیتا ہے اور اس کے مذہب کو حدیث کے مخالف نہیں کہا جا سکتا۔

(۵): پانچویں بات یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح حدیث کی بنا پر جو قول اختیار کیا جائے۔ ائمہ اربعہ کے اجماع کے خلاف نہ ہو۔

(۴): واضح احادیث توڑ مروڑ کر اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے لیے ایسی عجیب وغریب تاویلات کرنا جس پر اپنے دل میں بھی شک، شبہ ہو۔

(۵): یہ سمجھنا کہ صرف میرے امام کا مسلک حق ہے اور دوسرے مذاہب نعوذ باللہ باطل ہیں یہ بھی تقلیدِ جامد یا تقلید میں غلو ہے۔

(۶): بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ کے درمیان افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے، حلال وحرام کا اختلاف نہیں مثلاً آمین آہستہ کہی جائے یا زور سے، رکوع کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں، ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف پر یہ سب طریقے جائز ہیں اختلاف محض افضلیت میں ہے۔ ان اختلافات کو حلال، حرام کی حد تک پہنچا کر امت میں انتشار پیدا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

(۷): جہاں ائمہ میں جائز وناجائز کا اختلاف ہے وہاں بھی اختلاف کو علمی حدود کی حد تک رکھنا ضروری ہے اسے جنگ وجدل کا ذریعہ بنانا، ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی، عیب جوئی اور بدگمانی کسی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

متشددین کی خدمت میں گزارش!

مسئلہ تقلید پر جو کچھ نقل کیا گیا اس کا مقصد صرف امت مسلمہ کی اکثریت کا نقطہ نظر واضح کرنا تھا۔ بعض حضرات جب توحید وشرک پر کوئی کتاب لکھنے بیٹھتے ہیں تو بعض فروعی مسائل جیسے توسل اور تقلیدِ ائمہ متبوعین وغیرہ میں اختلاف کو کفر اور اسلام کا اختلاف بنا کر اچھے خاصے مسلمانوں کو کفار ومشرکین کی صف میں لا کھڑا کر دیتے ہیں۔

www.darulfeman.com

بہر حال اگر کسی کو اس نقطہ نظر سے اختلاف ہو تو وہ اپنے موقف پر قائم رہے لیکن ائمہ مجتہدین پر شریعت سازی یا مقلدین پر کفر و شرک کے الزامات عائد کرنا نہایت ہی خطرناک طرزِ عمل ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ مسلمانوں کی شان و شوکت اور ہیبت و عظمت کو ہمیشہ آپس کی خانہ جنگی نے تباہ کیا ہے اور فروعی مسائل پر لڑائیوں سے ہمیشہ اسلام دشمن لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ متشدد غیر مقلدین کے لیے مشہور اہلِ حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں کی تحریر مشعلِ راہ ہے۔

ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میں فقط جماعت اہلِ سنت کو فرقہ ناجیہ جانتا ہوں حنفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی، یا ظاہری اہلِ حدیث، یا اہلِ سلوک اور کسی کے حق میں، ان میں سے گمانِ بد نہیں رکھتا۔ اگرچہ مجھ کو یہ بات معلوم ہے کہ ہر گروہ کے اندر ان میں سے کچھ مسائل خلافِ دلائل بھی ہیں اور بعض موافقِ نصوص۔ بعض فتوے ان کے صحیح اور بعض ضعیف یا مردود ہیں۔ اس لیے حکم اکثر کو ہے نہ اقل کو اور ائمہ سلف سے جو عمل بعض احادیث میں متروک ہو گیا ہے اس کے بیس عذر ہیں جو کتاب جلبِ المنفعت [۱] میں لکھے گئے ہیں۔

ائمہ سلف پر طعن مخالفتِ سنت کا کرنا انصاف کا خون بہانا ہے ہاں جو مقلدان کے بعد وضوح دلیل کتاب و سنت کے تقلید رائے بحت پر جامد ہیں ان کو خاطی سمجھتا ہوں لیکن گمراہ بحت ہیں جانتا، نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں نہ معاذ اللہ ان کو کافر کہوں۔

مسائل و عبادات و معاملات میں اختلاف اہلِ علم مکفر نہیں ہوتا ہے غایۃً مافی الباب یہ ہے کہ خطاء فی الاجتہاد یا خطا فی الفہم ہوتی ہے۔ جس کو علماء پہچانتے ہیں۔ اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر قائل و فاعل اس خطا کا اپنے قصد میں مخلص غیر متعصب تھا اور کسی وجہ قوی سے شبہ میں گرفتار ہو گیا تو وہ خطا اس کی معاف ہو جاوے۔ اگر جمود اس خطا پر عمداً براہ نفاق و شقاق خدا اور رسول ﷺ کے ہے تو محل نہایت کا

[۱] ترکِ احادیث کے اعذار کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا رسالہ رفع الملام بھی۔

www.darulfeman.com

اندیشہ ہے۔لیکن کسی مسلمان راجی وخائف کی نسبت ایسی بدگمانی کرنا کچھ ضروری نہیں ہے:نحن نحکم بالظواہر واللہ اعلم بالسرائر۔[1]

---

[1] القاء المنن بالقاء المحن بحوالہ ماہنامہ فاران مئی ۱۹۶۳ء (تقلید کی شرعی حیثیت)

☆.....☆.....☆

www.darulleeman.com

www.daruleman.com

باب ششم

شرک کی مذمت!

انسان فطری طور پر فقیر ومحتاج ہے اور زندگی کی ہر مشکل میں فطرۃً ایک اللہ کی طرف مائل اور متوجہ ہوتا ہے۔لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے نفع ونقصان پر اسباب وعوامل کا پردہ ڈال رکھا ہے۔اس لیے انسان اسباب واشیاء کو نفع وضرر کا مالکِ حقیقی سمجھنا شروع کر دیتا اور جب اس کی توجہ اور میلان مخلوق کی طرف مکمل اور تام جاتا ہے تو اسی کو اپنا رب مان لیتا ہے۔اس کو مستقل طور پر نافع اور ضرر رساں سمجھ کر اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے اس مخلوق سے مدد طلب کرتا ہے اور یہی چیز اس کو غیر اللہ کے آگے سجدہ ریز کر دیتی ہے۔پھر غیر اللہ سے محبت اور غیر اللہ کی عبادت اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہے۔

اگر چہ ایسا انسان بعض اوقات زبان سے اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس کا دل کبھی ایک اللہ کے ذکر،اس کی حمد وثناء اسے مالک اور متصرف ماننے سے خوش نہیں ہوتا،جبکہ اس کے ساتھ دوسرے جھوٹے معبودوں کے مالک اور متصرف ہونے کا ذکر نہ کیا جائے۔جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مشرکین کی یہ حالت بیان کرتے ہیں:

﴿واذا ذکِر اللہ وحدہ اشمآزت قلوب الذِین لا یومنون بِا لاخِرۃِ واذا ذکِرا لذِین مِن دونِہِ اِذا ھم یستبشِرون﴾(زمر:۴۵)

''جب صرف ایک اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے(کہ وہ بلا شرکت غیرے تمام کائنات کا مختار، مالک اور متصرف ہے)تو ان لوگوں کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تب وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔''

مشرکین کی ایک عام صفت!

الغرض مشرکین کے سب گروہوں میں یہ بات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے کہ مخلوق میں سے جس

www.darulemaan.com

شئے کی بھی پرستش یا اطاعت کرتے ہیں دراصل اس چیز کو نفع ونقصان پہنچانے والی خیال کر کے ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ عمل ایک عظیم جرم ہی نہیں بلکہ خالق کائنات کے خلاف بغاوت بھی ہے۔ اللہ کی فرماں روائی اور اس کے ملک میں کسی کو شریک کرنا، اس کی بادشاہی میں کسی کو مستقل طور پر متصرف ماننا، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین اور رب العالمین نہ ماننے کے برابر ہے۔ دنیا کے مجازی حکمران سخت سے سخت جرم کو معاف کر دیتے ہیں لیکن باغیوں کے ساتھ نرمی نہیں کرتے جب ان عارضی حکام کی حکومت سے انکار کرنا اتنا بڑا جرم ہے تو پھر خالق کائنات اور مالکِ حقیقی کے باغیوں کا کیا انجام ہوگا؟ سوچ اور عبرت کا مقام ہے کیونکہ کفر وشرک کی حالت میں مرنے والے ہرگز نہیں بخشے جائیں گے۔ ان کی سزا دائمی ہوگی البتہ کفر وشرک کے سوا دوسرے گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب قابلِ معافی ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب اس کے سارے گناہ بخش دے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِن الله لا يغفِر ان يشرِك بِهِ ويغفِر مادون ذٰلِك لِمن يشآ ط ومن يشرِك بِا اللهِ فقد ضل ضللا م بعيداo﴾ (النسا:۱۱۶)

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس (جرم عظیم) کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے سوا (جرم چاہے جتنے ہوں) اور جس نے شریک ٹھہرایا (کسی کو) اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿افحسِب الذِين كفروآ ان يتخِذوا عِبادِى من دونِى اولِيآ ط انآ اعتدنا جهنم لِلكفِرِين نزلا ﴾ (سورۃ الکھف:۱۰۲)

''کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو میرے سوا کارساز؟ بے شک ہم نے جہنم کو کفار کی مہمانی کے لیے تیار کر رکھا ہے۔''

www.darulemaan.com

جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی مخلوق کے سامنے جھکتا ہے۔اللہ جل شانہ کی بے نیاز ذات کی طرف سے اس پر حقیقی نصرت وبرکت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور یہ شخص کل قیامت کے دن بے کسی، شرمندگی اور رسوائی کی حالت میں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لا تجعل مع اللهِ اِلٰها آخر فتقعد مذموما مخذولا﴾ (بنی اسرائیل:۲۲)

''نہ ٹھہرا اللہ کے ساتھ کوئی معبود ورنہ پھر تم پشیمان اور خوار ہو کر بیٹھ رہو گے۔''

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

﴿ فتلقی فی جهنم ملوما مدحورا﴾ (بنی اسرائیل رکوع نمبر۱۴)

''(یعنی اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ) ورنہ تم کو دوزخ میں ملامت زدہ اور دھکے دے کر پھینک دیا جائے گا۔''

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنی قوم اور عوام الناس کو کتنی نصیحتیں کی ہوں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے صرف ان اقوال کو بیان فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو فرمائے۔کیونکہ باپ اپنے بیٹے کو جو نصیحت کرتا ہے وہ سراسر سچائی اور خلوص ہوتی ہے چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿و اذ قـال لـقمان لِابنِه وهو يعِظه يبنى لا تشرِك بِا اللهِ ط اِن الشِرك لظلم عظِيم ﴾ (سورۂ لقمان:۱۳)

''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے (چھوٹے) بیٹے! کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا، شرک بہت بھاری ناانصافی ہے۔''

اس سے بڑھ کر ناانصافی کیا ہوگی عاجز مخلوق کو خالق مختار کا درجہ دیا جائے اور اپنی جان پر اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ اشرف المخلوقات ہو کر عاجز مخلوق کے سامنے سربسجود ہو جائے۔جب نصاریٰ نے پولس کی تعلیمات کے زیرِ اثر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور جز قرار دیا تو قرآن مجید میں ان

www.darulieman.com

کے عقیدہ کی تردید یوں نازل ہوئی:

﴿لقد کفر الذِین قالوا اِن الله هوالمسِیح ابن مریم ط وقال المسِیح یبنِیٓ اِسرآ ئِیل اعبد والله ربی وربکم ط اِنہ من یشرِك بِاللهِ فِقد حرم الله علیهِ الجنة وما وئه النار ط وما لِلظلِمِین مِن انصارo﴾ (المائدہ:۷۲)

''بے شک کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تو مسیح ابن مریم ہے حالانکہ مسیح نے خود یہ کہا کہ اے بنی اسرائیل بندگی کرو تم اللہ کی جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کے ساتھ، حرام کی اس پر اللہ نے جنت اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور کوئی نہیں بے انصافوں کا مدد کرنے والا۔

شرک کا انجام!

اور جو بدبخت اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز اور حاجت روا مانتے ہیں اور ان سے یہ امید وابستہ کئے ہوئے ہیں کہ جب ان پر کوئی آفت آئے گی تو وہ (جھوٹے معبود) انہیں بچالیں گے۔ ایسے لوگوں کی مثال اللہ تعالیٰ نے کس خوبی سے بیان فرمایا ہے:

﴿ مثل الذِین اتخذوا مِن دونِ اللهِ اولِیآ کمثلِ العنکبوتِ ج اِتخذت بیتا ط واِن اوهن البیوتِ لبیت العنکبوتِ لوکانوا یعلمونo﴾ (سورۃ العنکبوت:۱۴)

ان لوگوں کی مثالیں جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی بنا لیے ہیں مکڑی جیسی ہے کہ بنایا اس نے جالے کا گھر اور (تم سب جانتے ہو کہ) سب گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش ان کو سمجھ ہوتی۔''

ان کی توقعات مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں وہ تو ہوا کے جھونکے کو بھی برداشت نہیں کرسکتا چہ جائیکہ بادو باراں یا طوفان سے ان کی حفاظت کرے پس جو بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو بچانے والا اور محافظ سمجھے گا اور اللہ تعالیٰ سے تعلق توڑ کر غیروں کے ساتھ تعلق جوڑے گا یا ان پر بھروسہ

www.urduchannel.com

کرے گا۔ان کی مثال اسی نادان مکڑی کی سی ہے جو اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے اور امیدوں کے محلات تعمیر کرنا چاہتی ہے۔

بلاشبہ خالق کائنات کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنالینا اور اسے اپنا کارساز سمجھنا انتہائی بدبختی اور حماقت ہے۔کائنات میں موجود مخلوقات اور مصنوعات میں جب کوئی عاقل غور وفکر کرتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ عالم کا پیدا کرنے والا، باقی رکھنے والا اور اس میں ہر قسم کے تصرفات کرنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے۔اس کے دست قدرت میں سارے آسماں وزمیں ہیں۔ہر چیز، فرشتے، سورج وچاند اور جن وانس سب اپنی ذات اور کمالات میں ہر دم اسی کے محتاج اور دست نگر ہیں۔پس عبادت کے لائق بھی بجز اس کے کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ادیانِ سماویہ توحید کی صحت اور شرک کے غلط اور باطل ہونے پر متفق ہیں۔اب بھی ان تحریف شدہ کتب یعنی تورات، انجیل، زبور اور دیگر انبیا علیہم السلام کے صحائف میں ایسے جملے بکثرت ملتے ہیں جن سے انبیاء علیہم السلام کا ایک اللہ کی بندگی اور عبادت کرنا اور اپنی اقوام اور امتوں کو ایک اللہ کی عبادت اور اسی پر بھروسہ کرنے کی دعوت دینا ثابت ہوتا ہے۔انبیاء علیہم السلام نے اپنے اقوال اور اعمال سے واضح کیا کہ وہ ایک اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی دوسرے کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی اور کی بات کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ ہر نبی کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کی عبادت بھی کرے تو اس کی تمام نیکیاں ضائع ہو جائیں گی اور شرک کا انجام حرمان وخسران کے سوا کچھ نہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ومن یدع مع اللہ الٰھا اٰخر لا برھان لہ بہ فانّما حِسابہ عندربّہ ط انّہ لا یفلوح الکافرون﴾ (المؤمنون:۱۱۷)

''جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے بے شک کامیاب نہیں ہوں گے انکار کرنے والے۔''

www.tarjeeman.com

اور سورہ انعام میں فرماتے ہیں:

﴿ولقدهدى الله يهدى به من يّشاء من عباده ط ولواشركوا لحبط عنهم ما كانوا يعملون﴾ (سورہ انعام:۸۸)

"یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اس پر چلاتا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتے (ان سے وہ اعمال) جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔"

اسی طرح سورہ زمر میں ارشاد ہے کہ:

﴿ ولقد اوحى اليك والى الذين من قبلك لئن اشركت ليحبطن عملك ولتكونن من الخٰسرين بل الله فاعبدوكن من الشاكرين وما قدرواالله حق قدره والارض جميعا قبضته يوم القيامٰ ولسّمٰوٰت مطويت بيمينه ط سبحانه وتعالىٰ عما يشركون ٥﴾ (الزمر:۶۵-۶۷)

"بے شک وحی کی گئی ہے تجھ کو اور جو تجھ سے پہلے تھے کہ اگر (بالفرض ومحال) تو نے بھی شریک مان لیا تو ضائع ہو جائیں گے تیرے اعمال اور تم بھی نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ ہی کی عبادت کر اور ہو جا شکر کرنے والوں میں سے اور نہیں پہچانی انہوں نے اللہ کی قدر جیسے کہ حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا اور (اس کی شان تو ایسی عظیم ہے کہ) زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ سے۔ وہ پاک ہے ہر عیب سے اور بہت بالاتر) (اونچا) ہے اس سے جو کہ اس کا شریک بتلاتے ہیں۔"

حدیث شریف میں شرک کی مذمت!

اگرچہ شرک کی نفی اور مذمت میں بہت سی احادیث ہیں لیکن یہاں صرف تین احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱): حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

www.darueeman.com

((یارسول اللہ ای الذنب اکبر عنداللہ؟ قال ان تدعواللہ ندّاوھو خلقك))(الحدیث متفق علیہ مشکوٰۃ باب الکبائر)

''اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ کون سا ہے؟ فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔''

(۲)اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اجتنبو االسبع الموبقات قالوا!ما ھن یا رسول اللہ ؟ قال الشرك با اللہ ، والسحر و قتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق ، واکل الربوٰا واکل مال الیتیم ، والتولّی یوم الزحف وقذف المحصنات المومنات الغافلا ت))(متفق علیہ مشکوٰۃ)

''کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق قتل کرنا، سود کھانا اور یتیم کا مال کھانا اور لڑائی کے دن پیٹھ پھیر کر (جنگ سے) بھاگنا اور ایماندار پاکدامن بے خبر عورتوں پر تہمت لگانا۔''

(۳): اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دس باتوں کے ساتھ وصیت کی ہے:

((قال لا تشرك باللہ شیئا وان قتلت او حرقت))(الحدیث ، رواہ احمد مشکوٰۃ)

''(فرمایا کہ) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا اگرچہ تجھے قتل کر دیا جائے یا تو جلا دیا جائے۔''

مشرکانہ عقائد کے اثرات!

حقیقت یہ ہے کہ مشرکانہ عقائد ایسے کثیف اور دبیز پردے ہیں جو ہمیشہ صاحبِ عقیدہ اور اصل حقیقت کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں اور مشرک حقائق کے دریافت کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب ایک شخص کوئی غلط عقیدہ مان لیتا ہے تو اس کی عقل اور فکر اس عقیدہ پر جمی رہتی ہے اور اس کے افکار

www.aqeedeman.com

کی ترقی اور جدوجہد رک جاتی ہے۔ پھر وہ بہت سے خرافات کو مان لیتا ہے اور حقیقی کمالات سے دور، ذلت اور پستی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ اس کی ساری زندگی وحشت، اوہام اور خوف وہراس کی نذر ہو جاتی ہے، حیوانات کی معمولی سی حرکت اور پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ غلط تصورات کی بدولت وہ دنیوی زندگی میں خوشحالی کے کافی وسائل سے محروم ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی دائمی عذاب اور پریشانی میں گرفتار رہے گا۔

صحیح راستہ!

اس لیے ہر شخص (خواہ انس ہو یا جن) پر فرض ہے کی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے۔ اسی ذات کو خالقِ کائنات، رب العالمین مانے، وہی پیدا کرنے والا، ہمارے مصائب ومشکلات کو دور کرنے والا، ہماری حاجتوں کو پورا کرنے والا، ہماری عزت وذلت، مرنا جینا، اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہی علیم وخبیر عالم الغیب والشہادۃ اور کائنات کی تمام حقیقتوں کو جاننے والا ہے۔ وہی ذات ہے جس کے علم نے کائنات کے ہر ذرے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کے ظاہر وباطن ہر آن دیکھنے اور جاننے والا ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ مخلوقات کا عمل وقول کوئی سوچ وسوسہ اور راز کی چیز اس سے پوشیدہ نہیں:

﴿إِن الله لا يخفى عليهِ شيء فِي الا ر ضِ ولا فِي السما ﴾ (آل عمران:۵)

''بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں۔''

نیز ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ تمام مخلوق خواہ انس یا جن، فرشتہ ہو یا نبی مرسل صحابی ہو یا ولی، بادشاہ ہو یا فقیر، حاکم ہو یا محکوم، جاندار ہو یا بے جان سب کو اس کے محتاج وغلام مان لیں ہر طرف سے کٹ کر صرف ایک اللہ تعالیٰ کے وفادار اور شکر گزار بندے بنیں اس کی عظمت اور جلال کو سمجھیں، اس کے ہر حکم آگے سر تسلیم خم کر دیں اور اپنی عبادات کو ہر قسم کی مشرکانہ آمیزش سے پاک کر کے دل وجان سے اس کی

عبادت کریں اوراس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔

بندے پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب حاصل کرنے کے لیے یا سفارشی بنانے کے لیے بھی کسی مخلوق کی عبادت نہ کرے اور نہ ہی عبادت کی شکل وصورت اختیار کرے۔کفار ومشرکین کا یہی طریقہ تھا۔وہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے اور جب انہیں ٹوکا جاتا تو جواب میں کہتے تھے کہ بے شک بڑا خدا تو ایک ہی ہے جس نے آسمان وزمین پیدا کئے ہیں۔لیکن ہم ان چھوٹے خداؤں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ہم خدائے واحد کے قریب ہوجائیں اور کبھی کہتے کہ یہ اصنام اور بت ہماری عبادت سے خوش ہوکر بڑے خدا کے حضور میں سفارش کریں گے اور ہماری عبادتیں اور دعائیں وہاں تک پہنچادیں گے۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ويعبدون مِن دونِ الله ما لا يضرهم ولا ينفعهم ويقولون هٰؤلآءِ شفعآونا عِنداللهِ ط سبحٰنه وتعالى عمايشرِكون﴾(سورہ یونس:۱۸)

''اور یہ مشرک عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو(عبادت نہ کرنے کی صورت میں)نہ نقصان پہنچاسکتی ہیں اور نہ(عبادت کرنے کی صورت میں)نفع دے سکتی ہیں اور کہتے ہیں یہ(معبود)تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے نزدیک(اس لیے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔)وہ پاک ہے ہر عیب سے اور بہت بالاتر)(اونچا)ہے اس سے جو کہ اس کا شریک بتلاتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ الا لِلهِ الدِين الخالِص ط والذِين اتخذوا مِن دونِه اولِيآء ما نعبدهم اِلا لِيقرِبونآ اِلى اللهِ زلفىٰ ط اِن الـله يحكم بينهم فى ما هم فيهِ يختلِفون ط اِن الله لا يهدِى من هو كٰذِب كفّار﴾(سورۃالزمر:۳)

''خبردار اللہ تعالیٰ ہی کے لیے(شرک وریا سے) خالص بندگی ہے اور جن لوگوں نے بنالیے

ہیں اس کے سوا اور حمایتی اور کہتے ہیں ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے مگر محض اس لیے کہ یہ ہم کو اللہ تعالیٰ کا مقرب بنا دیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کر دے گا ان میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے ہیں البتہ اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو ہو جھوٹا حق نہ ماننے والا۔''

ان آیات میں یہی بتایا گیا ہے کہ مشرکین بتوں کی عبادت، ان کو خالق و مالکِ حقیقی سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق و مالک حقیقی اور کائنات میں متصرف مانتے تھے۔ لیکن قرب الٰہی، دعاؤں اور عبادات کو اللہ تک پہنچانے کے لیے اصنام اور بزرگ ہستیوں کی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ اسی لیے مشرکین ٹھہرائے گئے اور توحید خالص سے محروم ہو کر دائمی خسارے میں پڑ گئے۔

البتہ دعا کی درخواست کے لیے علماء کرام اور صالحین کی خدمت میں حاضر ہونا اس سے بالکل جدا ہے۔ کیونکہ جب کوئی مسلمان کسی اللہ والے صالح آدمی سے دعا کی درخواست کرتا ہے تو اس کی عبادت نہیں کرتا اور مسلمان سے دعا کی درخواست کرنا قرآن وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے جیسا کہ توسل کے باب میں مفصل گزر چکا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام، اولیاء اور صلحاء سے محبت رکھنا اور ان کی تعظیم واحترام کرنا اس ضمن میں شمار نہیں اور نہ ہی یہ غیر اللہ کی عبادت ہے بلکہ ہم کو ان ہستیوں سے محبت اور ان کی تکریم و تعظیم کا حکم ہے کہ اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

شرکِ خفی!

کوئی عبادت یا دینی کام یا نیک عمل اس لیے کرنا تا[1] کہ لوگوں کے دل میں انسان کی وقعت اور قدر ومنزلت پیدا ہو جائے۔ شرک خفی اور ریا کہلاتا ہے اس کی کئی قسمیں ہیں۔

[1] یعنی اگر کوئی نیک عمل لوگوں کو دکھانے کے لیے اس لئے کرتا کہ وہ اسی طرح کا عمل کریں تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن ایسا کرنے سے اکثر لوگ بالآخر ایسے ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنی ریا کاری کا علم بھی نہیں ہوتا۔

(۱): کوئی شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو نہ اس کے رسول ﷺ پر، نہ ہی آخرت پر، لیکن لوگوں کو باور کرائے کہ وہ مسلمان ہے اور بظاہر دینی اعمال بھی کرتا رہے یہ اصل ایمان میں ریا ہے اسے نفاق کہتے ہیں اور اس کے کرنے والے کو منافق، یہ جلی اور عظیم شرک سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اس کا ٹھکانہ حشر میں دوسرے مشرکین و کفار سے زیادہ سخت اور اس کا ٹھکانہ سب سے نیچے انتہائی خراب اور برا ہے۔

نفاق کی بھی کئی قسمیں ہیں، اول یہ کہ اسلام کا اندر سے بالکل منکر ہے لیکن مسلمانوں میں افتراق وانتشار پھیلانے اور فتنہ برپا کرنے کے لیے خود کو مسلمان ظاہر کرے اور ظاہری فرمانبرداری جیسے نماز وغیرہ ادا کرے دوم یہ کہ اندر سے تو صاف منکر ہے لیکن مسلمانوں سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے ایمان واسلام کا اظہار کرے اگرچہ فتنہ انگیزی کا خیال نہ ہو۔ سوم یہ کہ دل سے اسلام کا صاف منکر تو نہ ہو لیکن اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان بھی نہ ہو بلکہ کفر وایمان میں متردد اور متذبذب ہو۔ لیکن صرف مسلمانوں کی جماعت میں رہنے کی وجہ سے بظاہر اسلام کا نام لیوا ہو، حبِ دنیا اور شہوات کے غلبہ نے اس کو ایسا نکما بنا دیا ہو کہ دنیا کی خاطر وہ اسلام اور مسلمانوں کی بربادی اور دین کے مذاق اڑانے کو مباح عمل کی طرح برداشت کر لیتا ہو اور ایسے حالات میں بھی جہاد سے جی چراتا ہو جب کہ اسلام اور مسلمانوں کو اس کی سخت ضرورت ہو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر ان مختلف قسم کے منافقین کی نشاندہی کی ہے اور ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یوم تری المؤمِنین والمؤمِناتِ یسعی نورھم بین ایدِھم وبِایمانِھم بشرٰکم الیوم جنٰت تجرِی مِن تحتِھا الانھار خلِدِین فِیھا ط ذٰلِك ھوالفوز العظِیمO یوم یقول المنافِقون والمنٰفِقٰت لِلذِین امنوا انظرونا نقتبِس من نورِکم ج قیل ارجِعوا ورآءکم فالتمِسوا نورا ط فضرِب بینھم بِسورٍ لہ باب باطِنہ فِیہِ الرحمۃ وظاھِرہ مِن قِبَلِہِ العذاب ینادونھم الم نکن معکم ط قالوا بلٰی ولٰکِنکم فتنتم انفسکم وتربصتم وارتبتم وغرتکم الامانِی حتی جآء

امر اللہِ وغرّکم بِاللہِ الغرور فالیوم لا یؤخذ مِنکم فِدیۃ ولا مِن الذِین کفروا ط ماوٰکم النار ط ھِی مولکم وبِئس المصِیر o﴾ (سورۃ الحدید:۱۳-۱۵)

''یعنی اس (قیامت کے) دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نوران کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا (ان سے کہا جائے گا) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسی جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تا کہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں مگر ان سے کہا جائے گا پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی جانب عذاب ہوگا۔ منافق اہلِ ایمان کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ مومن جواب دیں گے ہاں، مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں میں ڈال دیا ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے، شک میں پڑے رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی توقعات نے یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ پہنچا اور دھوکہ دیتا رہا تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا دغا باز (شیطان) پس آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے وہی تمہاری خبر گیری کرنے والا ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔''

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

﴿اِن المنافِقِین فِی الدرکِ الاسفلِ مِن النارِ ج ولن تجِد لھم نصِیرا o﴾ (النساء:۱۴۵)

''یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔''

(۲): ریا کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ پر اور رسول پر ایمان تو ہے لیکن عبادات اور دوسرے خیر کے کام لوگوں کو دکھلاوے اور نام و نمود کے لیے کرے۔ مثلاً لوگوں کے سامنے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، لیکن

www.darulaman.com

اگر پاس کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو نہ نماز ہے اور نہ زکوٰۃ۔ یہ بھی نہایت خطرناک ہے اور ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

(۳): ریا کی تیسری قسم یہ ہے کہ فرائض میں تو ریا نہ ہو لیکن اگر کوئی پاس ہو تو نفل نمازوں، صدقات اور دیگر مستحب کا اہتمام ہو لیکن اگر کوئی نہ دیکھے تو نہ نوافل ہوتے ہیں نہ مستحبات یہ ریا بھی بہت خطرناک ہے۔

(۴): چوتھی یہ کہ تنہائی میں اتنی عبادت یا کارِ خیر نہیں کرتا جتنی لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے۔ ایسی عبادات پر بھی شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔

(۵): پانچویں قسم کی ریا یہ ہے کہ جو عبادات اور نیک عمل لوگوں کے سامنے کرتا ہے وہی ان کی غیر موجودگی اور تنہائی میں بھی کرتا ہے لیکن لوگوں کے سامنے زیادہ نشاط مسرت اور حسن ادا سے کرتا ہے مثلاً کوئی ہمیشہ تہجد پڑھتا ہو لیکن مہمان کے سامنے زیادہ نشاط اور خوبصورت طریقے سے پڑھے، اس میں بھی ریاء ہے۔ اگرچہ پہلی اقسام سے کم۔ [1]

---

[1] البتہ اگر کارِ خیر میں رضا اور خوشنودی تو اللہ کی مقصود ہو اور جب کوئی دیکھنے والا ہو تو نشاط اور حسنِ ادائیگی بھی نہ ہو مگر طبیعت خوش ہو جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اس عمل کو قبول فرمالے بلکہ اگر اس کو خوشی صرف اس بنا پر ہو کہ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کو ظاہر فرمایا اور ہمارے برے اعمال اور گناہوں کو پوشیدہ کئے رکھا۔ کیونکہ نیکی کا اظہار کرانا اور گناہوں پر ستاری کرنا، قیامت کی رسوائی سے بچاؤ کی علامت ہے۔ اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں جو اعمال کرتے اور اپنے اندر کچھ کیفیات محسوس کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال اور اندرونی کیفیات کا اظہار ہوتا کہ لوگوں میں ان کی شہرت ہو لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو محض ظاہری حالت اور کیفیت بڑے لوگوں کی طرح بنا لیتے ہیں اور ایسے اعمال کا اظہار کرتے ہیں جو انہوں نے کئے نہیں ہیں۔ مثلاً کسی نے نفلی روزے نہیں رکھے لیکن ہونٹوں کو خشک رکھے یا کہتا ہے کہ میرا روزہ ہے یا تہجد نہیں پڑھتا مگر ایسی حالت بنا لیتا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۶): چھٹی قسم ریا کی وہ ہے جس میں کسی کی موجودگی یا غیر موجودگی کی پرواتو نہ ہولیکن یہ چسکا لگا ہوا ہو کہ کسی طرح لوگوں کو میرے نیک اعمال اور باطنی حالات کی خبر ہو جائے اور مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتا ہو۔

(۷): ریا کی ساتویں قسم یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو محض اس لیے ترک کر دے کہ لوگ اسے ریا کاری کا طعنہ دیں گے یا اپنی خفیہ مجلسوں یا اپنے خیال میں اسے ریا کار سمجھیں گے یہ بھی ریا کی ایک بہت خطرناک قسم ہے کیونکہ یہ شخص بے عملی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنے اخلاص اور بزرگی کا ثبوت مہیا کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرے ریا کا عمل کر کے اپنی نیکو کاری وغیرہ کی شہرت چاہتے ہیں۔شرک خفی اور ریاء کی کچھ قسمیں اور بھی ہیں جو بہت باریک ہیں لیکن قابلِ معافی ہیں۔

جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ازالۃ الخفاء میں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۸) یا ایسے الفاظ اور اشارے کرتا ہے تا کہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا تہجد گزار ہے یا صوفیا کی چند باتیں سیکھ کر انہیں دہراتا ہوتا کہ لوگ اس کو بڑا صوفی اور تصوف کا ماہر سمجھیں یا چند روایات وحکایات سیکھ لے اور انہیں صرف اس لیے بیان کرتا ہے کہ لوگوں پر یہ ثابت کر دے کہ بڑا عالم ہے یا کوئی غمگین اور رونی صورت بنائے تا کہ لوگ سمجھیں کہ اسکو دین کا بہت بڑا غم ہے وغیرہ وغیرہ۔تو یہ ایسی شدید قسم کی ریا اور مکاری ہے و کسی بھی با حیا انسان سے اس کا صدور ممکن نہیں۔یہاں یہ خیال رہے کہ یہ چیزیں دوسروں میں تلاش نہ کریں کیونکہ یہ نفل نماز، روزہ، تہجد، ذکر، اللہ تبارک وتعالیٰ کو یاد کرنا اور یاد رکھنا اور دین کا غم وغیرہ تو بہت اہم امور ہیں لیکن صرف ریا کی وجہ سے ریا اور شرکِ خفی بن جاتے ہیں۔اس لیے دوسروں کے بارے تو خیال بس یہی رہے کہ وہ اس کو اچھی نیت سے کر رہے ہیں اور اس کی یہ کیفیت یقینی ہے۔البتہ اپنے بارے میں ہر وقت یہ گمان رہے، اپنی جان کا محاسبہ کرے اور اپنی نیت کو خالص تر بنانے کی کوشش کریں اور ریاء کے خوف سے کسی عمل کو بھی نہ چھوڑیں۔یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔

www.qaturaeman.com

فرمایا اے ابوبکر! شرک تم میں چیونٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے حضرت ابوبکر نے کہا کہ کیا شرک اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود بنائے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ البتہ شرک چیونٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو تم کہہ لیا کرو تو اس (شرک) کا قلیل اور کثیر سب جاتا رہے (یعنی معاف ہو جائے) فرمایا کہو:

((اللھم انی اعوذبك ان اشرك بك انا اعلم واستغفرك لمالا اعلم))(ازالة الخفا:۲/۱۳۰)

شرکِ خفی اور ریاء کی مذمت!

جو شخص ریا کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا اگرچہ وہ بظاہر اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کو ماننے اور ایمان کا دعویٰ کرے، یا اس شخص کا دل یقین سے خالی ہو یا پھر اس کا یقین مخلوق پر ہے اور مخلوق سے اس کو جتنے اجر کی توقع ہے اتنی امیدیں اللہ تعالیٰ سے نہیں یا وہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق دونوں سے اجر و داد حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین بہت کمزور ہے۔

قرآن و حدیث میں ریا کی بہت مذمت کی گئی ہے اور اس پر بہت سخت وعیدیں آئی ہیں جیسا کہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((من صلی یرائی فقد اشرك))

''جس نے ریا کی نیت سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔''

((ومن صام یرائی فقد اشرك ومن تصدق یرائی فقد اشرك))(رواہ ،احمد مشکوٰة باب الریا السمعته)

www.darulemaan.com

''اور جس نے ریا کے ارادہ سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے ریا کی نیت سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا۔

شیخ الحدیث مولانا زکریا المہاجر مدنی قدس سرہ ریا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو عبادت بھی ہو خالص اللہ جل شانہ کی رضا کے واسطے ہو، اس میں کوئی فاسد غرض ریاء، شہرت، وجاہت وغیرہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ اس میں نیکی برباد اور گناہ لازم ہو جاتا ہے۔ احادیث میں بہت کثرت سے اس پر وعیدیں اور تنبیہیں وارد ہوئی ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں حق سبحانہ وتقدس کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ سب شریکوں میں سب سے زیادہ بے پرواہ ہوں، جو شخص کسی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کر دیتا ہے میں اس عبادت کرنے والے کو اس کے (بنائے ہوئے) شریک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں۔ (مشکوٰۃ) یعنی وہ اپنا بدلہ اور ثواب اس شریک سے جا کر لے لے مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا ہے وہ اس شریک سے اپنا ثواب مانگ لے۔ اللہ جل شانہ شرکت سے بے نیاز ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم لوگ دجال کا تذکرہ کر رہے تھے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس کا میں تم پر دجال سے بھی زیادہ خوف کرتا ہوں۔ ہم نے عرض کیا ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ شرکِ خفی ہے۔ مثلاً ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے (اخلاص سے شروع کی ہے، کوئی شخص اس کی نماز دیکھنے لگے) وہ آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے اپنی نماز لمبی کر دے۔

ایک دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف

www.qurueeman.com

چھوٹے شرک کا ہے۔ صحابہ ﷡ نے عرض کیا، چھوٹا شرک کیا ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، ریاء ہے۔ ایک حدیث میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جس دن حق تعالیٰ شانہ بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ عطا فرمائیں گے، ان لوگوں سے یہ ارشاد ہوگا کہ جن کو دکھانے کے لیے کئے تھے، دیکھو ان کے پاس تمہارے اعمال کا بدلہ ہے یا نہیں (مشکوٰۃ)

قرآن پاک میں بھی حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

﴿فمن کان یرجوا لقاء ربّه فلیعمل عملا صالِحا ولا یشرِك بِعِبادِ ۃربِّهِ احدا۝﴾ (سورہ کہف: ع۱۲)

''جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور ان کا محبوب ومقرب بننا چاہے) تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

حضرت ابن عباس ﷛ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میں بعضے (دینی) مواقع میں اللہ جل شانہ کی رضا کے واسطے کھڑا ہوتا ہوں مگر میرا دل چاہتا کہ میری اس کوشش کو لوگ دیکھیں۔ حضور ﷺ نے اس کا کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا، حتیٰ کہ آیت نازل ہوگئی۔

حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں صدقہ کرتا ہوں اور صرف اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہے مگر دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہیں۔ اس پر آیت شریفہ نازل ہوئی۔

ایک حدیث قدسی میں ہے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کرتا ہے تو میں اس عمل کو سارے ہی کو چھوڑ دیتا ہوں۔ میں صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لیے ہو۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی۔ ایک اور حدیث میں ہے اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کے ساتھ بہترین تقسیم کرنے والا ہوں۔ جو

www.daruleman.com

شخص اپنی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی کر دے میں اپنا حصہ بھی اس ساجھی کو دے دیتا ہوں۔ایک حدیث میں ہے کہ جہنم میں ایک وادی ایسی ہے جس سے جہنم خود بھی چار سو مرتبہ روزانہ پناہ مانگتی ہے وہ ریاکار قاریوں کے واسطے ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد آیا ہے کہ جُبُّ الحزن سے پناہ مانگا کرو (یعنی غم کے کنویں سے جو جہنم میں ہے) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس میں کون لوگ رہیں گے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں۔ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں نازل ہوئی۔(درمنثور)

قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿یآ یها الذین امنوا لا تبطلوا صدقٰتکم بالمنّ والاذٰی لا کالذی ینفق ماله رئاء الناس﴾ (بقرہ:ع۳۶)

''اے ایمان والو!تم احسان جتا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (برباد) کرتا ہے وا اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے خرچ کرتا ہے اور ایمان نہیں رکھتا، اللہ پر اور قیامت کے دن پر،اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک چکنا پتھر ہو جس پر کچھ مٹی آگتی ہو(اور اس مٹی پر کچھ سبزہ وغیرہ جم گیا ہو) پھر اس پتھر پر زور کی بارش پڑ جائے سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے گی (اسی طرح احسان کرنے والوں،ایذا دینے والوں اور ریاکاروں کا خرچ کرنا بھی صاف اڑ جائے گا اور قیامت کے دن) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (یعنی یہ جو نیکیاں کی تھیں،صدقات دئے تھے یہ سب ضائع جائیں گے)۔''

اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن پاک میں ریاء کی مذمت فرمائی ہے ایک حدیث میں ہے قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کا فیصلہ ہوگا،ان میں ایک تو شہید ہوگا اس کو بلایا جائے گا اور

www.darueman.com

بلانے کے بعد دنیا میں جو اللہ جل شانہ کے انعامات اس پر ہوئے تھے وہ اس کو یاد دلائے جائیں گے، اس کے بعد اس سے مطالبہ ہوگا کہ اللہ جل شانہ کی ان نعمتوں میں رہ کر تو نے کیا نیک عمل کیا۔ وہ عرض کرے گا کہ میں نے تیری رضا جوئی میں جہاد کیا حتی کہ شہید ہو گیا (اور تجھ پر قربان ہو گیا) ارشاد ہوگا کہ یہ جھوٹ ہے تو نے جہاد اس لیے کیا تھا کہ لوگ بڑا بہادر بتائیں گے، وہ تجھے بہت بڑا بہادر بتا چکے ہیں (جو غرض عمل کی تھی وہ پوری ہوگئی ہے) اس کے بعد اس کو جہنم میں پھینک دینے کا حکم کیا جائے گا اور تعمیل حکم میں اس کو منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

دوسرا شخص ایک عالم ہوگا جس کو بلا کر اللہ جل شانہ کے انعامات اور احسانات جتا کر اس سے بھی دریافت کیا جائے گا کہ اللہ جل شانہ کی ان نعمتوں میں تو نے کیا عمل کیا وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور لوگوں کو سکھایا تیری رضا جوئی میں قرآن پاک پڑھتا رہا۔ ارشاد ہوگا، یہ سب جھوٹ ہے، یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا تھا کہ لوگ کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا عالم، بڑا قاری ہے۔ سو لوگوں نے کہہ دیا ہے (اور جو مقصد اس محنت سے تھا وہ حاصل ہو چکا ہے) اس کے بعد اس کو بھی جہنم میں پھینکنے کا حکم کیا جائے گا اور تعمیلِ حکم میں منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص ایک سخی ہوگا جس پر اللہ جل شانہ نے دنیا میں بڑی وسعت فرما رکھی تھی، ہر قسم کے مال سے اس کو نوازا تھا۔ اس کو بلایا جائے گا اور جو انعامات اللہ جل شانہ نے اس پر دنیا میں فرمائے تھے وہ جتا کر سوال کیا جائے گا کہ ان انعامات میں تیری کیا کارگزاری ہے وہ عرض کرے گا کہ میں نے خیر کا کوئی موقع جس میں خرچ کرنا آپ کو پسند ہو ایسا نہیں چھوڑا جس میں آپ کی خوشنودی کے لیے خرچ نہ کیا ہو۔ ارشاد ہوگا یہ جھوٹ ہے تو نے محض اس لیے خرچ کیا کہ لوگ کہیں گے بڑا سخی ہے سو کہا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اس کو جہنم میں پھینکنے کا حکم ہوگا اور تعمیلِ حکم میں منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (مشکوٰۃ بروایۃ مسلم)

www.darulegman.com

اس حدیث میں اور اسی طرح اور احادیث میں یہاں ایک شخص کا ذکر آتا ہے۔ اس سے ایک قسم آدمیوں کی مراد ہوتی ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ معاملہ صرف تین آدمیوں کے ساتھ کیا جائے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ تینوں قسم کے آدمیوں سے یہ مطالبہ ہوگا اور مثال کے طور پر ایک ایک آدمی کا ذکر کر دیا۔

ان کے علاوہ اور بھی احادیث میں کثرت سے اس پر تنبیہ کی گئی اور بہت زیادہ اہمیت سے حضور اقدس ﷺ نے اپنی امت کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ خالص اللہ جل شانہ کے لیے کیا جائے اور جتنا بھی اہتمام ہو سکے اس کا کیا جائے کہ اس میں ریا اور نمود و شہرت اور دکھاوے کا شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ مگر اس جگہ شیطان کے ایک بڑے مکر سے بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ دشمن جب قوی ہوتا ہے وہ مختلف انواع سے اپنی دشمنی نکالا کرتا ہے، یہ بہت مرتبہ آدمی کو وسوسہ کی بدولت کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں اہم ترین عبادتوں سے روک دیا کرتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شیطان اول تو نیک کام سے روکتا ہے اور ایسے خیالات دل میں ڈالا کرتا ہے جس سے اس کام کے کرنے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو۔ لیکن جب آدمی اپنی ہمت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے روکنے پر عمل نہیں کرتا تو وہ کہا کرتا ہے تجھ میں اخلاص تو ہے ہی نہیں، یہ تیری عبادت، محنت بے کار ہے، جب اخلاص ہی نہیں ایسی عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ اور اس قسم کے وسوسے پیدا کر کے نیک کام سے روک دیا کرتا ہے اور جب آدمی رک جاتا ہے تو اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے (احیاء) اس لیے اس خیال سے نیک کام کرنے سے رکنا نہیں چاہیے اور اس کی دعا کرتا رہے کہ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے لطف سے دستگیری فرمائے۔ تاکہ نہ تو دین کا مشغلہ ضائع ہو، نہ برباد ہو۔

وما ذلك على اللهِ بعزيز. (فضائلِ صدقات حصہ اول: ۱۶۱ تا ۱۶۵)

www.urdueman.com

www.daruleeman.com

باب ہفتم

محبت مطلوبہ!

شرابِ روح پرور ہے محبت رب یزداں کی

اللہ رب العزت نے انسان میں ایک مادہ محبت کا ایسا رکھ دیا ہے جس نے اسے ذوق تپش سے آشنا کر دیا ہے۔ اسی کی برکت سے زندگی کا سوز و ساز ہے اور ہر دم ایک نیا محشر بپا ہے اسی کی وجہ سے دلِ مضطر سیماب ہے، خود تڑپتا اوروں کو تڑپاتا ہے اور اس کے نالہ ہائے غم آسمان کی بجلیوں سے کھیلتے ہیں۔

محبت کا یہ مادہ انسان کو محبوب کے حصول اور رضا کے لیے جان کی بازی لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کی محبت جس چیز سے وابستہ ہو جائے یہ اس کا غلام و بندہ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہی محبت اسکے تمام امراض، پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب بھی بن جاتی اور علاج بھی۔ اگر محبت دنیا فانی سے ہو تو انسان آشفتہ حال، آگ بگولہ بن کر دنیا کے حصول کے لیے محنت و مشقت کرتا ہے، دور دراز ممالک دریافت کرتا ہے دولت و عزت و شہرت حاصل کرنے کیلئے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے اور کبھی حسنِ فانی کا پروانہ بن کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔

محبت اگر اس تغیر پذیر دنیائے بے ثبات سے ہوگی تو انسان ناکام و نامراد ہوگا۔ لیکن اگر یہی محبت جمالِ لازوال سے، اس کا سوز و گداز حسنِ ازلی و ابدی خالقِ کائنات رب العالمین کے لیے ہو، اس کی وفا اللہ اور رسول ﷺ کے لیے ہو جائے تو اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول سے ان کی رضا اور احکام کو معلوم کر کے دنیا میں ایمان و عمل سے اجالا کر دے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت انسان کی ساری پراگندگی اور پریشانی کا حل ہے۔ یہ وہ آبِ حیات ہے جو اس کو بقائے دوام عطا کرتی ہے اور اسکے لیے دنیا و آخرت میں سرمایہ فلاح و نجاح ہے۔

جس طرح مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

www.darulsalam.com

﴿والذین امنوا اشد حبًّا لِلّٰہِ﴾ [1] اسی طرح شعائر اللہ اور حضور ﷺ کی محبت بھی ضروری ہے۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿ فالذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوالنورالذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون ۝﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''یعنی پس جو لوگ اس نبی ﷺ پر ایمان لائے اور اس کی (محبت و تعظیم کے ساتھ) حمایت کی اور (مخالفین کے مقابلہ میں) اس کی مدد کی اور تابع ہوئے اس نور (قرآن مجید) کے جو اِن کے ساتھ بھیجا گیا ہے وہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔''

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿تعزروہ وتوقروہ﴾

یعنی ''تم ان کی (محبت و تعظیم کے ساتھ) مدد کرو اور دل سے ان کی تعظیم کرو۔''

معلوم ہوا کہ مکمل کامیابی اور فلاح پانے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جو نبی کریم ﷺ پر سچے دل سے ایمان لائے، ان کی تکریم و تعظیم میں کوئی کمی نہ کرے، ان کے دین کی نصرت اور تائید کیلئے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو اور قرآن کریم کے ارشادات پر عمل کرنے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہو۔

حضرت مولانا مفتی شفیع ؒ لکھتے ہیں:

یہاں فلاح پانے کے لیے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں۔ اول آنحضرت ﷺ پر ایمان، دوسرے آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم، تیسرے آپ کی امداد، چوتھے قرآن کریم کا اتباع۔

تعظیم و تکریم کے لیے اس جگہ ﴿عزروہ﴾ لایا گیا ہے۔ یہ تعزیر سے مشتق ہے تعزیر کے اصل معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں۔

---

[1] اور جو ایمان والے ہیں ان کو اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

www.darulemaan.com

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ﴿عزروه﴾ کے معنی تعظیم وتکریم کرنے کے بتلائے ہیں اور مبرد نے کہا کی اعلی درجے کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

﴿عزروه و نصروه﴾ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کے احکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے دنیا کے حکام کا اتباع جبراً وقہراً کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت ومحبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ ﷺ کی عظمت ومحبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ ﷺ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو کیونکہ امت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ وہ امیر وحاکم ہے اور امت محکوم ورعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری امت ان کی محبّ۔ایک یہ کہ رسول اپنے کمالاتِ علمی، عملی، اخلاقی کی بنا پر صاحبِ عظمت ہے اور ساری امت ان کے مقابلے میں پست عاجز۔ ہمارے رسول کریم ﷺ میں سب شانیں درجہ کمال میں پائی جاتی ہیں۔اس لیے امت پر لازم ہے کہ ان کی ہر شان کا حق ادا کریں۔بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں، بحیثیت امیر وحاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیتِ کمالاتِ نبوت ان کی تعظیم وتکریم بجالائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہیے تھی کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول ﷺ کے بارے میں صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم وتوقیر اور احترام وادب کو بھی لازمی قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جابجا اس کے آداب سکھائے گئے ہیں۔اس آیت میں۔﴿عزروه و نصروه﴾ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی۔﴿و تعزروه و توقروه﴾ آیا ہے۔(معارف القرآن:۴/ ۸۷)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ ﷺ سے والہانہ محبت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿النبی اولٰی بِالمؤمِنین مِن انفسِہِم﴾

یعنی ''نبی کریم ﷺ ایمان والوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔''

یہاں اللہ تعالیٰ وہ محبت اور تعلق بیان فرمارہے ہیں جو حضور ﷺ کو مومنین سے ہے کہ تمہارے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی اور تربیت وغیرہ میں آپ ﷺ تم پر تمہارے نفوس سے بھی زیادہ مہربان ہیں۔ حضور ﷺ کا لطف وکرم اور تمہاری دنیاوآخرت کی کامیابی اور خیرخواہی کا جو خیال آپ ﷺ رکھتے ہیں وہ خود تمہارے نفوس بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مامن مؤمن الا وان اولی الناس بہ فی الدنیا والاخرۃ اقراء ان شئتم النبِی اولٰی بِالمؤمِنین مِن انفسِہِم))(الحدیث بخاری:۲)

کوئی مومن ایسا نہیں جس کے لئے میں دنیا اور آخرت میں سارے مسلمانوں سے زیادہ اولیٰ اور اقرب نہ ہوں اگر تمہارا دل چاہے تو (اس کی تصدیق کیلئے) یہ آیت پڑھ لو۔﴿النبی اولی بالمؤمنین﴾

جب حضور ﷺ کو ہمارے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہے اور ہم میں سے ہر ایک پر ساری دنیا سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں تو پھر اس کا لازمی اثر ہونا چاہیے کہ ہر مومن کو آپ سے محبت، تمام مخلوقات اور اپنی جان سے بھی زیادہ ہو۔ آپ ﷺ کی تکریم وتعظیم بھی سب سے زیادہ کرے اور آپ ﷺ کا حکم بھی تمام مخلوقات اور نفس کی ساری خواہشات پر مقدم رکھے اور سب سے زیادہ واجب التعمیل سمجھے۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قل اِن کان اباء کم وابنائکم واِخوانکم وازواجکم وعشِیرتکم واموال نِ اقتر فتموھا وتِجارۃ تخشون کسادھاومسٰکِن ترضونھااحب اِلیکم مِن اللہِ ورسولِہ وجِھادفِی سبِیلِہ

www.urdueman.com

فتربصوا حتی یأتِی الله بِامرِہ ط والله لایھدِی القوم الفٰسِقِین o﴾ (سورۃ التوبہ:۲۴)

''آپ ﷺ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار جس کے بند ہونے کا اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیارے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں لڑنے سے، تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم (سزا) اور اللہ ہدایت نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔''

اپنی اولاد، ماں باپ، بھائی اور اپنی بیوی وغیرہ سے محبت اور تعلق انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اس طرح کاروبار، مال اور مکانات وغیرہ کے ساتھ انسان کا لگاؤ اس لیے ہے کہ وہ آرام وچین، عزت وراحت سے زندگی گزارنے میں ان کا محتاج ہے اسلام دینِ فطرت ہونے کی وجہ سے انسان کے فطرتی تقاضوں اور ضرورتوں کا صحیح اور مناسب خیال رکھتا ہے اور ہمیں ان اشیاء کے نہ حاصل کرنے یا ان کی طرف کامل بے توجہی کا حکم نہیں کرتا۔ بلکہ صرف ان کی محبت میں کھو جانے سے منع کرتا ہے تاکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر غالب نہ آجائیں اور احکامِ شریعت پر عمل کرنے کے خلاف رکاوٹ نہ بن جائیں۔ جہاد و ہجرت جیسے عظیم اعمال کے لیے مانع نہ ہو جائیں۔

اگرچہ ان آیات میں ان لوگوں سے خطاب ہے جنہوں نے ہجرت و جہاد فرض ہونے کے وقت ان اشیاء کے لگاؤ اور محبت سے مغلوب ہو کر ہجرت و جہاد نہ کیا لیکن آیت شریفہ کے الفاظ عموم کے ساتھ تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اس درجہ کی محبت لازم ہے جس پر کوئی دوسری محبت اور تعلق غالب نہ آجائے جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:

((لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین))

(بخاری ومسلم کتاب الایمان: ۱/۷،٤٧)

www.alrehman.com

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (پورا) مؤمن نہیں ہوگا جب تک میں اس کو اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاں۔''

اسی طرح بہت سی صحیح احادیث میں فرمایا گیا ہے جب تک ہر ایک امتی میں حضور ﷺ کی محبت دنیا کی ہر چیز حتی کہ اپنی جان سے زیادہ نہ ہو، اس وقت تک اس کو ایمان کی حقیقت اور لذت نہیں حاصل ہو سکتی۔

محبت کے اسباب!

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ محبت کرنے کے چند اسباب ہوتے ہیں، پہلا سبب قرابت ہے۔ اس میں محبت کا سبب صرف قرب ہوتا ہے کسی خارجی چیز جیسے حسن وکمال کی مزید ضرورت نہیں پیش آتی، بلکہ جہاں جتنا قرب ہوتا ہے وہاں اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی جیسے والدین کی محبت اولاد سے دوسرے اقرباء سے زیادہ ہوتی ہے اسے طبعی محبت کہتے ہیں۔ محبت کا دوسرا بڑا سبب احسان ہے۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ سچے محسن سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔ تیسرا سبب حسن و جمال ہے۔ کیونکہ حسنِ صورت، حسنِ سیرت اور آواز کا حسن یہ سب اپنے اندر کشش رکھتے ہیں۔ محبت کا چوتھا سبب کمال ہو سکتا ہے، کسی میں غیرت، شجاعت، دانائی وغیرہ کے کمالات ہوں تو انہیں دیکھ کر یا سن کر صاحبِ کمال سے محبت ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات محبت کا منشاء صرف عقلی ہوتا ہے اگر چہ طبعی طور پر آدمی کراہت اور گھبراہٹ محسوس کرے۔ بیمار کو تلخ دوا، آپریشن یا انجیکشن وغیرہ سے تکلیف وگھبراہٹ ہوتی ہے مگر عقلاً اس کو صحت یابی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ دوائیں وغیرہ اس کی محبوب و مطلوب بن جاتی ہیں۔

حضور ﷺ سے اختیاری محبت!

چونکہ محبت طبعی ایک اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت اور اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے تو حضور ﷺ کے ساتھ محبت سے مراد حب عقلی ہے یعنی یہ بات سوچ سمجھ کر حضور ﷺ سے محبت کرے کہ ہر مؤمن پر اللہ تعالیٰ کی محبت لازم ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے

حضور ﷺ کی محبت اور اتباع ضروری ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے دل میں طبعی دنیاوی تعلقات ہوں لیکن وہ ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی پرواہ نہ کرے تو وہ بھی آیاتِ مذکورہ کی وعید سے خارج ہے اور اللہ و رسول ﷺ کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے۔ جیسے دوا کی تلخی یا آپریشن سے طبعاً گھبراہٹ قابلِ ملامت نہیں اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد کی محبت کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کے بجالانے میں غیر اختیاری تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس تکلیف کو برداشت کر کے وہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے تو وہ قابلِ ملامت نہیں۔

عقلی محبت اختیاری ہوتی ہے، لیکن اس پر قناعت کر لینا درست نہیں۔ حضور ﷺ کے ساتھ بھی محبت ابتدا میں اختیاری اور عقلی ہوتی ہے لیکن اس میں اس قدر ترقی ہونی چاہیے کہ یہ محبت طبعیت پر غالب آجائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی تعمیل میں وہ لذت محسوس ہو جو ہر تکلیف کو راحت اور ہر تلخی کو شیریں بنا دے۔ یہی محبت کا اعلیٰ مقام ہے اور اسی درجہ کی محبت کی ترغیب دی گئی ہے صحیحین کی ایک حدیث میں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

((ثلث من کن فیه وجد حلاوة الایمان ان یکون الله ورسوله احب الیه مما سواهما))

(الحدیث بخاری و مسلم کتاب الایمان)

یعنی ''جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پائے گا ایک یہ کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت سب (چیزوں، مخلوق) سے زیادہ ہو۔''

اس حدیث شریف میں حلاوتِ ایمان سے مقصود محبت کا یہی درجہ ہے جو انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو اور بڑی سے بڑی مشقت، حتیٰ کہ اپنی جان کی قربانی تک کو لذیذ بنا دے اور ہر قسم کی محبت چاہے طبعی ہو یا عقلی پر اس (تعمیلِ احکام) کو ترجیح دے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اس پر شاہد ہے۔ چند

www.darulemaan.org

واقعات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

حضور ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت!

(۱): بنی دینار کی ایک مسلمان خاتون کے والد، بھائی اور خاوند غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے۔ جب اس کو ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملتی کہ وہ شہید ہوگیا ہے تو وہ: ''اِنا لِلہِ وانا اِلیہِ راجِعون'' پڑھتی اور بے قراری سے دریافت کرتی رہی کہ رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ ﷺ بالکل صحیح وسالم ہیں اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگی مجھے بتاؤ تا کہ دیکھ کر یقین کرلوں، جب اس نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تو فرمانے لگیں کہ آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے تمام مصیبتیں ہیچ ہیں۔ (سیرت ابن ہشام)

(۲): حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا آپ کو نبی کریم ﷺ سے کتنی محبت تھی آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدائے پاک کی قسم حضور ﷺ ہم لوگوں کے نزدیک اپنے مالوں سے، اولاد سے اور سخت پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔ (شفاء حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم)

(۳): حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مولا کیسان فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے، دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ جو کچھ اس میں ہے اسے پی رہے ہیں۔ اتنے میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ وہ کام کر آئے؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جی ہاں! حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا کام؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان کو اپنے پچھنے کے خون کا غسالہ دیا تھا تا کہ جو کچھ اس میں ہے یہ اسے بہا دیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اسے تو یہ پی گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم اسے پی گئے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیوں؟ انہوں نے عرض کیا مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور ﷺ کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ

کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے نقصان پہنچے گا۔ یعنی تم شہید کئے جاؤ گے اور تم سے جنگ کرنے والے مبتلائے عذاب ہوں گے، تمہیں جہنم کی آگ نہ پہنچے گی مگر وعدہ الٰہی ﴿وان منکم الاّ واردھا﴾ کے پورا کرنے کے لیے ہے (جس کے ایفاء کے لیے پل صراط پر سے گزرنا ہوگا)۔ ۱

(۴): اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے پچھنے لگوئے اور فرمایا کہ خون کو درندوں، پرندوں اور انسانوں سے بچا کر کسی جگہ دفن کردو۔ میں آپ ﷺ کے پاس سے لے گیا اور پسِ پردہ اسے پی گیا۔ اس کے بعد میں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔ حضور ﷺ ہنس پڑے۔ (رواہ ۲ الطبرانی ورجالہ ثقات)

(۵): اسلام کے ابتدائی دور میں جب مکہ مکرمہ کے کفار نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے زمینِ حرم سے نکالا تو ابوسفیان بن حرب نے ان سے کہا میں تجھے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ آج تیری جگہ محمد (ﷺ) ہو اور تم اپنے گھر میں مامون ومحفوظ رہو؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو بہت بڑی بات ہے خدا کی قسم! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ سیدِ دو عالم ﷺ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔ اس پر ابوسفیان نے کہا میں نے ساری عمر میں کسی کو کسی کے ساتھ ایسی محبت کرنے والا نہیں دیکھا جیسا کہ محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں (الشفاء: ۲/ ۱۹۔ ابن ہشام: ۱۶۸۲)

(۶): سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ہمیشہ مسجد نبوی میں اس ستون کے پاس شوق کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے جس کے پاس حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ ۳

اسی طرح سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ان تمام جگہوں پر نوافل

---

۱ عند ابی نعیم واخرجہ ابن عساکر عن سلمان نحوہ مختصرا ورجالہ ثقات کذا فی الکنز ۴/ ۵۶۔ ۲ کذا فی مجمع الزوائد: ۷/ ۲۷۰۔ ۳ بخاری الصلوات الی الاسطوانۃ۔

ادا کرتے تھے جہاں جہاں ان کے والد عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نماز ادا کی تھی کہ ان مقامات پر حضور اقدس ﷺ نے نماز ادا فرمائی تھی۔ ۱؎

(۷): حضرت ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ہمارے پاس نبی ﷺ کے کچھ بال مبارک ہیں۔ہم نے انہیں انس سے یا (یہ کہا کہ) انس کے گھر والوں کے پاس سے پایا ہے، تو عبیدہ نے فرمایا کہ ان بالوں میں سے ایک بال بھی مجھے مل جائے تو (ساری) دنیا سے جو اس دنیا میں ہے اس سے وہ مجھ کو زیادہ پیارا ہوگا۔ (بخاری شریف کتاب الوضوا/۹۶)

(۸): ایک صحابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنی جان ومال سے زیادہ پیارے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں تو حضور ﷺ مجھے یاد آجاتے ہیں تو اس وقت تک مجھے صبر اور قرار نہیں آتا جب تک حاضر خدمت ہو کر ایک نظر دیکھ نہ لوں اور جب میں اپنے مرنے کا اور حضور ﷺ کی وفات کا خیال کرتا ہوں تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وفات کے بعد حضور ﷺ تو جنت میں پہنچ کر انبیاء علیہم السلام کے بلند مقام پر پہنچا دیئے جائیں گے اور میں اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں گیا بھی تو میری رسائی تو اس عالی مقام تک تو نہیں ہو سکے گی تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گا۔رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس بات کا جواب اپنی طرف سے نہیں دیا یہاں تک کہ سورۃ النساء کی یہ آیت نازل ہوئی ۲؎:

﴿ومن يطع الله والرسول فاولٰئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهدآء والصٰلحين ج وحسن اولٰئك رفيقا﴾ (ن:۶۹)

۱؎ بخاری باب المساجد علی طریق المدینہ۔ ۲؎ رواہ الطبرانی فی الصغیر والاوسط ورجالہ صحیح غیر عبداللہ بن عمران العابدی وہو ثقۃ مجمع الزوئد ۷/۷۔

www.qaricean.com

''اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے لوگ بھی ان (حضرات) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے اور یہ حضرات سب اچھے رفیق ہیں۔''

(۹): صحیح حدیث میں بروایتِ انس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی تو آپ ﷺ نے فرمایا، تم نے قیامت کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرے ساتھ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گے جس سے محبت رکھتے ہو حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اسلام کے بعد کبھی کسی چیز پر ایسے خوش نہیں ہوئے جتنا کہ حضور ﷺ کے اس فرمان سے خوش ہوئے (کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ سے والہانہ محبت تھی) اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں اس محبت کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوں گا۔ اگرچہ میں نے ان حضرات جیسے بہت زیادہ اعمال نہیں کئے ہیں۔(بخاری باب الاحکام و مسلم کتاب البر والصلتہ واللفظ لہ)

(۱۰): الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ قریش کے سفیر کی حیثیت سے حضور ﷺ کے سامنے ہوئے اور آپ ﷺ سے طویل گفتگو کرتے رہے اور نظریں بچا بچا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات معلوم کرتے رہے واپس جا کر کفار قریش کے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت اور تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

''اے قریش میں بڑے بڑے بادشاہوں کے یہاں گیا ہوں۔ قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کو بھی دیکھا ہے اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا

www.darulemaan.com

کہ اس کی جماعت اس کی ایسی تعظیم کرتی ہو جیسے محمد ﷺ کی جماعت ان کی تعظیم کرتی ہے جب وہ وضوء کرتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے بچے ہوئے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اگر وہ تھوکتے ہیں تو لپک کر لے لیتے ہیں اور جس کے ہاتھ پر پڑ جائے اسکو بدن اور منہ پر مل لیتا ہے۔ جب ان کو کسی بات کا حکم فرماتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے سامنے بولتے ہیں تو بہت نیچی آواز سے، ادب کی وجہ سے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اگر ان کے سر یا داڑھی کا کوئی بال گرتا ہے تو اس کو تبرکاً اٹھا لیتے ہیں غرض میں نے کسی جماعت کو اپنے آقا کے ساتھ اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد ﷺ کی جماعت ان کے ساتھ کرتی ہے۔ تو جس قوم کو اپنے سردار سے اتنی محبت ہو اس پر غالب آنا ناممکن ہے۔ (ماخوذ از صحیح بخاری و سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۲۸)

حضور ﷺ سے محبت کی اہمیت اور اس کے ثمرات!

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ایمان و دین کی روح ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہے اس کے لیے حضور ﷺ کے ساتھ بھی محبت لازمی اور ضروری ہے کہ وہ ایسے جائز اسباب اختیار کرے جس سے محبت میں ترقی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو فیوض و برکات آپ ﷺ کے ذریعے پہنچائے ہیں۔ اس لیے جو کوئی بھی آپ ﷺ کو چھوڑ کر اللہ سے محبت کا اظہار کرے وہ بالکل غیر معتبر اور جھوٹا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کہ عظیم قربانیوں اور اعمال کا اصل محرک یہی جذبہ تھا۔ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ان کی والہانہ زندگی کا سبب تھا محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو دل میں بس جانے کے بعد محبوب کو ہر چیز پر غالب کر دیتی ہے۔ پھر نہ مال و جان کی پرواہ ہوتی ہے نہ ننگ و ناموس کی اور نہ ہی تکلیف و مشقت کا اندیشہ رہتا ہے۔

الغرض کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ جب انسان کے دل میں یہ جذبہ محبت جوش مارتا ہے تو شریعت پر پابندی نہایت آسان ہو جاتی ہے اور دینی تکالیف میں راحت محسوس ہوتی ہے اور جذبہ محبت

www.darulfeman.com

کی آگ دل میں بھڑک اٹھے تو انسان محبوب کے احکام کی تعمیل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور یہی حالت درحقیقت سچے موحد کی ہے۔ توحید اور محبت کوئی حکایت کی چیز نہیں بلکہ یہ ایک کیفیت ہے۔ مؤحد اور محبّ ایسا ہوتا ہے کہ اسکی نگاہ مستقل طور پر سوائے محبوب کے کسی اور چیز پر نہیں جمتی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں کے قلوب میں محبت بھڑکتی رہی ان کا سر دنیا کی کسی طاقت کے سامنے اور کسی در پر نہ جھک سکا۔

حضور ﷺ کے ادب واحترام کا حکم!

درحقیقت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حق ادا ہی تب ہو سکتا ہے جب دل میں حضور ﷺ کی عظمت ومحبت ہو، ورنہ بغیر محبت کے اطاعت ریا اور نفاق ہوتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں اسی لیے تعظیم ومحبت کو فرض کی گیا ہے اور جو ذرا بھی توہین کرے گا فیضِ رسالت سے ابدالآباد تک محروم رہے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ ﷺ کے سامنے زور سے بولنے اور ان کی آواز پر آواز بلند کرنے کی ممانعت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ یآ یھا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوتِ النبِي ولا تجھروا له بِا لقولِ کجھرِ بعضِکم لِبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون ﴾ (سورۃ الحجرات: ۲)

''اے ایمان والو! بلند نہ کیا کرو اپنی آوازوں کو نبی کریم ﷺ کی آواز سے اور نہ ان کے ساتھ زور سے بات کیا کرو جس طرح اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو (کہ بے ادبی کی وجہ سے) تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

اس آیت شریفہ کے اول مخاطب صحابہ کرام ﷺ ہیں، جن کی ایثار اور قربانیاں بے مثال ہیں۔ جن کی عبادات خشوع اور خضوع میں رنگی ہوئی ہیں۔ جو ہر معاملہ میں اور ہر وقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی ڈھونڈنے والے تھے۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے نبی کریم ﷺ کے حضور

www.darulemaan.com

میں آواز اونچی کی تو یہ بھی ایسی بے ادبی اور گستاخی ہوگی کہ تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں۔اس آیت کے نزول سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جس طرح کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو(درمنثور عن البیہقی)اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا(کذا فی الصحاح)اور حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ قدرتی طور پر بہت بلند آواز تھے۔یہ آیت سن کر بہت ڈر گئے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا(بیان القرآن از درمنثور)چند سطر آگے لکھتے ہیں:

اس جگہ کلیاتِ شریعہ اور اصولِ مسلمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ حبطِ اعمال یعنی اعمالِ صالحہ ضائع کر دینے والی چیز تو باتفاق اہلِ سنت والجماعت،صرف کفر ہے۔کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمالِ صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مؤمنین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے اور لفظ ﴿یآ یھا الذین امنوا﴾ کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر ہونا ثابت ہوتا ہے تو حبطِ اعمال کیسے ہوا۔

دوسرا یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعلِ اختیاری ہے،جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہوسکتا اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ ﴿انتم لا تشعرون﴾ یعنی "تمہیں خبر نہ ہو"،تو حبط اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوئی۔

سیدی حکیم الامت نے بیان القرآن میں اس کی توجیہہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ اشکالات وسوالات ختم ہو جاتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ معنی آیت یہ ہیں کہ مسلمانو!تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آوازیں بلند اور بے محابا جہر کرنے سے بچو کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط

www.qurtuba.com

اور ضائع ہو جائیں اور وہ خطرہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پیش قدمی یا ان کی آواز پر اپنی آواز بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسول ﷺ کا اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ ﷺ کی ایذا کا سبب ہے۔ لیکن اعمال وافعال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذا نہ ہوں۔ پھر ان سے ایذا کا احتمال ہے اس لیے ان کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصا یہ ہوتا ہے کہ اس کے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبطِ اعمال کا (معارف القرآن: ۱۰۲/۸)

اور ایک آیت میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ حضور ﷺ کو پکارتے وقت ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے عام آدمیوں کی طرح آواز نہ دیا کریں:

﴿لا تجعلوا دعآء الرسولِ بينكم كدعاءِ بعضِكم بعضا﴾ (سورۃ النور: ۶۳)

''تم لوگ (رسول کریم ﷺ) کے بلانے کو ایسا نہ بنالو جیسے تم (آپس میں) ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔''

اور اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿يآ يها الذين امنوا لا تقولوا راعِنا وقولواانظرنا واسمعوا وللكفِرين عذاب اليم﴾ (سورۃ البقرہ: ۱۰۴)

''اے ایمان والو تم (لفظ) راعنا نہ کہا کرو اور انظرنا کہا کرو اور (حضور ﷺ کی بات) توجہ سے سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اگر آپ ﷺ کے کسی ارشادِ مبارک

www.darulfeman.com

کو کبھی اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو عرض کرتے یارسول اللہ راعنا، یعنی ہماری رعایت فرمایئے گا، کیونکہ ہم پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں، دوبارہ سمجھا دیجئے۔ لیکن چونکہ یہود کی زبان عبرانی میں یہی لفظ ایسے معنی رکھتا ہے جس میں گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ایسے الفاظ سے احتراز کریں جس میں گستاخی کا ادنی شائبہ تک ہو اور ہر ایسے راستے کو بند کر دیا ہے جس طرف سے آپ ﷺ کی محبت اور عظمت کا رشتہ کمزور ہوسکتا ہو۔ مثلاً آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے عقد کرنے کو قرآن میں ناجائز قرار دیا کہ ایسی صورت میں دل میں وہ عظمت ولحاظ اور ادب واحترام باقی نہیں رہ سکتا جو آپ ﷺ کے ساتھ ضروری ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت!

اسی طرح قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف اور مناقب کو نہایت حکیمانہ انداز میں اسی مقصد کے لیے پیش کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ محبت وتعظیم میں اضافہ ہو۔

کیونکہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کی قابلیت کا اندازہ اس کے سپرد کئے ہوئے مریضوں کی حالت سے لگایا جاتا ہے اور استاذ کا کمال اس کے شاگردوں کی خوبیوں سے پہچانا جاتا ہے تو پیغمبر ﷺ کے کمالات اور اوصاف اور ان کی تربیت کا صحیح رنگ بھی ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿محمد الرسول اللهِ ط والـذين معه اشِد اء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركّعا سجدا يبتغون فضلاً مِّن اللهِ ورِضواناً سِيماهم فى وجوهِهِم مِن اثرِ السجودِ﴾ (سورۃ الفتح:۲۸)

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے صحبت یافتہ ہیں (وہ) کفار کے مقابلے میں سخت ہیں، آپس میں رحمدل ہیں (اے مخاطب) تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کرتے ہوئے کبھی سجدہ کرتے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلب گار ہیں ان کے ایمان اور عبادت کی علامت ان کے چہروں کے اثر سے آشکارا ہے۔''

www.darulemaan.com

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لِلفقراءِ المهاجِرين الذِين اخرِجوا مِن دِيارِهِم واموالِهِم يبتغون فضلًا مِّن اللهِ ورِضواناً وّ ينصرون الله ورسوله اولئِك هم الصٰدِقون﴾(سورۃ الحشر:۸)

﴿والذِين تبوّؤالدّار والاِيمان مِن قبلِهم يحِبون من هاجر اِليهِم ولا يجِدون فى صدورِهِم حاجة مّما اوتوا و يؤثِرون على انفسِهِم ولو كان بِهِم خصاصة قف ومن يوق شح نفسِه فاولئِك هم المفلِحون﴾(سورۃ الحشر:۹)

﴿والذِين جآ وامِن بعدِهِم يقولون ربنا اغفِر لناولِاخوانِنا الذِين سبقونا بِالاِيمانِ ولا تجعل فِى قلوبِنا غِلا لِلذِين امنوا ربنا اِنك رؤف رحيم﴾(سورۃ الحشر:۱۰)

(یعنی مال فئی میں حق) ان حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔

اور ان لوگوں کا حق ہے جو دارالاسلام اور ایمان میں انکے قبل قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے (انصار()) اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے اور اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ (خود) ان پر فاقہ ہی ہو اور جو شخص بخل سے محفوظ رکھا گیا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اور ان لوگوں کا (حق ہے) جو ان کے بعد آئے (یعنی مہاجرین اور انصار کے بعد) جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے۔ اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق اور رحیم ہیں۔

www.darulemaan.com

مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مناقب اور اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیعؒ آخر میں فرماتے ہیں۔

اس مقام میں حق تعالیٰ شانہ نے پوری امت محمدیہ کے تین طبقے کئے۔ مہاجرین وانصار اور باقی تمام امت۔ مہاجرین وانصار کے خاص اوصاف اور فضائل بھی اس جگہ ذکر فرمائے مگر باقی امت کے فضائل وکمالات اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز یہ بتلائی کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سبقتِ ایمانی اور ایمان کے ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے کو پہچانے اور سب کے لیے دعائے مغفرت کریں اور اپنے لیے یہ دعا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی مسلمان سے کینہ ونفرت نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے جتنے مسلمان ہیں ان کا ایمان واسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت ومحبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں اور ان کے لیے دعا کرتے ہوں جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں، اس لیے حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امت کے تمام مسلمان تین درجوں میں ہیں جن میں سے دو درجے تو گزر چکے (یعنی مہاجرین وانصار) اب صرف ایک درجہ باقی رہ گیا۔ یعنی وہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھیں ان کی عظمت پہچانیں۔ اب اگر تمہیں امت میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجے میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کسی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوال کیا (جب کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا) تو انہوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ تم مہاجرین میں سے ہو؟ اس نے انکار کیا پھر پوچھا انصار میں سے ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا۔ تو فرمایا بس اب تیسری آیت ﴿والذین جآ وامن بعدھم﴾ کی رہ گئی۔ اگر تم عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شان میں شک وشبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس درجے سے بھی نکل جاؤ گے۔

قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت ہم پر واجب ہے۔ حضرت

www.darulemaan.com

امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص کسی رضی اللہ عنہ کو برا کہے یا اس کے متعلق برائی کا اعتقاد رکھے اس کا مسلمانوں کے مال میں کوئی حصہ نہیں۔ پھر اسی آیت سے استدلال فرمایا اور چونکہ مالِ فئے میں حصہ ہر مسلمان کا ہے تو جس کا حصہ اس میں نہ رہا اس کا اسلام وایمان ہی مشکوک ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحاب محمد ﷺ کے لیے استغفار اور دعا کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ انکے آپس میں جنگ وجدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے (اس لیے کسی مسلمان کو مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ سے ان سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں) حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ یہ امت اس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی جب تک اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت وملامت نہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو برا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں زیادہ برا ہے اس پر اللہ عالی کی لعنت ہے۔

یہ ظاہر ہے زیادہ برے صحابہ رضی اللہ عنہ تو ہو نہیں سکتے۔ یہی ہوگا جو ان کی برائی کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو برا کہنا سبب لعنت ہے۔

عوام بن حوشبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس امت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہے وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل اور محاسن بیان کیا کرو تا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہو اور مشاجرات اور اختلافات جو ان کے درمیان پیش آئے ہیں ان کا ذکر نہ کیا کرو جس ان کی جرات بڑھے (اور وہ بے ادب ہو جائیں)۔ (یہ سب روایات تفسیرِ قرطبی سے لی گئی ہیں) (معارف القرآن: ۸/ ۳۸۲،۳۸)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کی وجہ!

بلا شبہ رسول اللہ ﷺ کی یہ پاک ومقدس جماعت امت کے عام افراد کی طرح نہیں۔ بلکہ وہ حضور ﷺ اور تمام امت کے درمیان محکم اور مضبوط واسطہ ہیں ان کی حیثیت حضور ﷺ کے نمائندوں کی ہے اور اسی

www.urdueman.com

لیے عام امت سے جدا ایک خاص امتیازی شان رکھتے ہیں۔ان کی تقدیس اور تعدیل پر ہمارے قرآن کریم، سنتِ نبوی اور دین کے تمام عقائد واحکامات کا دارومدار ہے۔وہ رسالت کے اولین مبلغ ہیں جن کے ذریعے دینِ حق پوری امت کو پہنچا۔

قرآن مجید میں رحمۃ اللعالمین کے تلامذہ یعنی صحابہ کرام ﷺ کی پاک سیرت اور بے مثال کردار کی مدح اور ستائش بہت کثرت اور تکرار کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔انہیں رضائے الٰہی اور جنت کی بشارتیں دی گئی ہیں اور امت کو ان کے ادب واحترام اور ان کی اقتداء کا حکم بھی دیا گیا ہے اور ان میں سے کسی کو برا کہنے پر سخت وعید بھی فرمائی ہے۔ان کی محبت کو رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ان سے بغض کو رسول اللہ ﷺ سے بغض قرار دیا ہے۔

صحابہ ﷺ کے بارے میں حضور ﷺ کی تاکید!

حضرت عبداللہ بن مغفل ﷺ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

((اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضافمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم)))(رواہ الترمذی)

''اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ (ﷺ) کے معاملہ میں، میرے بعد ان کو (تنقید وتشنیع کا) نشانہ نہ بناؤ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے بغض رکھا۔''

اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے ان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں گرفتار کردے۔حضرت ابوسعید خدری ﷺ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لا تسبوااصحابی فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مُدّاحدھم ولا نصفَہ))

www.darulemaan.com

''میرے اصحاب کو برامت کہو۔اگر تم لوگوں میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے تو صحابہ میں کسی ایک کے، ایک مد کے برابر ثواب کو نہیں پہنچ سکتا ہے نہ آدھے مد کے برابر۔''

اور ترمذی کی روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہتے ہیں تو تم کہو اللہ کی لعنت ہو تمہارے اس شر پر (یعنی تمہاری اس شر کی بات پر)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقدس اور عدالت اور ان کے ساتھ محبت، ان کی تعظیم و تکریم یقینی طور پر ثابت ہے جس شخص کی زندگی مجموعی طور پر اچھی اور پاکیزہ ہو اس پر کسی گناہ کبیرہ کا الزام عقلا و فطرت کی رو سے بھی اس وقت تک درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ مضبوط اور قطعی دلائل سے ثابت نہ ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام تو بہت ہی بلند ہے۔ان حضرات کا تقدس اور عدالت قرآن و سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔پس تاریخ کی جھوٹی، بے سند اور ضعیف روایات کی یہاں کوئی حیثیت ہی نہیں۔اسی لئے علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ:

جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض یا ان میں سے بعض کے ساتھ بغض رکھیں یا ان کو برا بھلا کہے، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ایسے لوگوں کا قرآن پر ایمان سے کیا واسطہ جو ان لوگوں کو برا بھلا کہتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے راضی ہونے کا اعلان کیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید و اعتراض کرنا دراصل نبی کریم ﷺ پر اور آپ کی تربیت پر اعتراض کرنا ہے کیونکہ پھر تو یہ وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کی شانِ تزکیہ صحیح اور کامل نہ تھی۔ورنہ جن حضرات نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کی تھیں اور جن کی خوبیوں پر خود قرآن مجید اور حضور ﷺ شاہد ہیں، ان حضرات میں روحانی بیماریاں، بددیانتی اور خود غرضی کیسے آئیں۔الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں پوری امت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کے انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ

www.darulemam.com

ہستیاں یہی ہیں۔ان کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم و تکریم،ان سے محبت رکھنا،ان کی مدح کرنا واجب ہے۔اگر کسی سے بظاہر کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور ان کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوئی تھی۔سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کے الفاظ سے لیا جائے گا:

﴿تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون﴾

''یہ ایک امت تھی جو گزر گئی ان کے اعمال ان کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیسا عمل کیا تھا۔''

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم الشان جماعت کے بارے میں اپنی زبان یا قلم سے کوئی ایسا حرف نہ نکالے جس سے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کی تنقیص یا کسرِ شان ہوتی ہو اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کوئی بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا دروازہ کھولتا ہے وہ دینِ اسلام کی بنیادوں کو کھودتا ہے اور وہ کبھی اسلام کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ،حضور ﷺ،صحابہ رضی اللہ عنہم اور اسلاف سے محبت!

الغرض اللہ جل شانہ کی ذات عالی ہی اشد محبت کی مستحق ہے کیونکہ محبت جن وجوہات کی بنا پر ہوا کرتی ہے وہ بدرجہ اتم ان میں جمع ہیں اور نبی کریم ﷺ کی محبت اس لیے نہایت ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی محبت ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی اطاعت کا ذریعہ ہے۔آپ ہی اقرب الناس الی اللہ یعنی سب سے زیادہ اللہ سے قریب ہیں۔اس کے بعد تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صالحین رحمہم اللہ کیساتھ محبت نہایت ضروری ہے۔گویا یہ محبت کی ایک زنجیر ہوئی جس کی کڑیاں یعنی سلف صالحین رحمہم اللہ کی محبت،صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت،نبی کریم ﷺ کی محبت اور اللہ کی محبت ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں (جس طرح کہ علمی سلسلہ کی زنجیر ہے کہ

www.aqaruleman.com

قرآن وسنت کا علم صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے تابعین کو منتقل ہوا اور پھر ان سے ان کے تلامذہ یعنی تبع تابعین کو قرآن وسنت کے حاملین کا یہ سلسلہ الحمدللہ آج تک جاری ہے۔

سلفِ صالحین سے محبت رکھنا، ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہی ہماری کامیابی وفلاح کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ کسی شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کا تعلق رکھنا اللہ پاک کی عظمت کا حق ادا کرنا ہے اور اس کا شمار بھی عبادات میں سے ہے حدیث شریف میں آتا ہے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس بندہ نے بھی اللہ پاک کے لئے کسی دوسرے بندے سے محبت کی اس نے اپنے رب کی عظمت وتوقیر کی۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ)

اللہ پاک سے محبت کے لئے اس کے محبوبین کی محبت ایک ناگزیر واسطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح اللہ عالی سے محبت کا ذریعہ حضور ﷺ ہیں اور ان سے محبت کا ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کا واسطہ سلف صالحین ہیں مجنوں جو لیلیٰ کے عشق میں مست تھا لیلیٰ کی گلی کے کتے کو محبت کی نظر سے دیکھتا تھا کتے سے محبت تو ہرگز مقصود نہ تھی لیکن لیلیٰ کے ساتھ محبت ہی کا اثر تھا جب وہ لیلیٰ کے گھر جاتا تو وہاں کا طواف کرنے لگتا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو، تو کہا:

امر علی الدِیارِ دِیارِ لیلیٰ واقبل ذاالجِدار وذاالجِدار وما حب الدِیارِ شغفن قلبِی ولکِن حب سکن الدِیار .

''میں گزرتا ہوں ان شہروں پر جو لیلیٰ کے شہر ہیں تو چومتا ہوں اس دیوار کو اور اس دیوار اور ان شہروں کی محبت نے میرے دل میں گھر نہیں کیا ہے مگر اس کی محبت نے جو ان شہروں میں رہ چکی ہے۔''

محبوب لذاتہ یعنی اصل محبوب تو صرف ایک ہی ہے لیکن محبوب سے متعلق اشیاء کی محبت، اس کی محبت کی علامت اور دلیل ہوتی ہے اور اس کی محبت بڑھانے میں مدد ومعاون ہوتی ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ ضرور بالضرور حضور ﷺ سے محبت رکھے گا اور جو حضور ﷺ سے محبت

www.darulfeeman.com

کرتا ہے وہ یقیناً صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور سلفِ صالحین کو علی الترتیب محبوب رکھے گا۔ گویا سلفِ صالحین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور انتہا میں حضور ﷺ سے محبت فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا عشق اور قرب حاصل کرنے کا ایک واسطہ اور اس کی محبت کی علامت ہے۔

اللہ تک پہنچنے کا دوسرا واسطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے۔ یعنی اللہ جل شانہ نے ہمیں اپنا قرب حاصل کرنے کے لئے دو واسطے مقرر فرمادیئے ہیں جن کے ذریعے ہمیں اللہ کی پسند اور ناپسند، اوامر اور نواہی کا علم ہو جاتا ہے۔ کتاب جو تمام انسانیت کے قانون اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسرے اپنے ایسے چنے ہوئے مقبول بندے جن کو بنی آدم ہی میں سے منتخب فرما کر اپنی پسند اور ناپسند کا عملی نمونہ اور کتاب کی عملی تفسیر بنا کر بھیجا۔

تجربہ گواہ ہے کہ کوئی کتاب کتنی ہی آسان، مفصل اور جامع کیوں نہ ہو۔ انسان کی تعلیم وتربیت کیلئے کافی نہیں ہوسکتی۔ انسان کی تربیت اور اصلاح کرنے والا انسان ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی اصلاح اور تعلیم کے لئے دو چیزوں کا سلسلہ جاری رکھا، ایک کتاب اللہ اور دوسرے رجال اللہ (اللہ والے لوگ) جن میں انبیاء علیہم السلام ان کے نائبین علماء ومشائخ سب داخل ہیں۔

دو شدید غلطیاں!

رجال اللہ (اللہ والوں) کے بارے میں لوگ دو مذموم غلطیوں کا شکار رہے ہیں یعنی افراط اور تفریط۔ دین میں اکثر فتنے اور فرقے بندیاں انہی دو غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ کہیں تو رجال اللہ کو اتنا بڑھا چڑھا دیا کہ نوبت رجال پرستی (بندوں کی عبادت) تک پہنچ گئی اور کہیں گھٹا مٹا کر حسبنا کتاب اللہ (یعنی) صرف اللہ کی کتاب ہی ہمارے لئے کافی ہے کا اعلان کرنے لگے اور حسبنا کتاب اللہ کی غلط تفسیر میں نبی کریم ﷺ، صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین اور سلف صالحین کو بالکل نظر انداز کرنا اپنا طریقہ بنالیا۔

اصل اور صحیح طریقہ تو یہی تھا کہ رجال اللہ سے ان کے شایانِ شان محبت رکھتے جو کہ نہایت

www.urduman.com

ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضور ایسے شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ جس کو ایک جماعت سے محبت ہے لیکن وہ ان کے ساتھ نہ ہو سکا؟ آپ نے فرمایا جو شخص جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ ہے یعنی آخرت میں اسی کے ساتھ ہوگا یا کر دیا جائے گا۔ سائل کا مقصد بظاہر یہ معلوم کرنا تھا کہ ایک شخص جو اہلِ تقویٰ کے کسی گروہ یا کسی مردِ صالح و متقی سے محبت کرتا ہو لیکن عمل اور سیرت میں ان کے درجہ کا نہ ہو بلکہ نیچے ہو، اس کا انجام کیا ہوگا۔ تو نبی کریم ﷺ کے جواب کا حاصل (اسی مناسبت سے) یہ ہوا کہ یہ شخص عمل میں کم ہونے کے باوجود انہی اللہ کے محبوب لوگوں کے ساتھ کر دیا جائے گا جن کے ساتھ اس کو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر اور دین کے تعلق سے، محبت تھی، اسی مفہوم یعنی ((المرء أمع من أحب)) کہ آدمی کا حشر قیامت میں اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو، کو بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنی عاقبت کو کامیاب و شاندار بنانے کے لئے اللہ والوں سے محبت کا تعلق قائم کر کے قیامت میں ان کی معیت حاصل کر لیں۔ حضور ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے:

((من احب لله وابغض لله فقد استكمل الايمان))

''جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے لئے (کسی سے) محبت کی اور اللہ تعالیٰ (ہی) کے لئے (کسی سے) دشمنی کی اس کا ایمان کامل ہے۔''

گمراہ فرقوں کی ابتدا!

پس دین میں تفریق و اختلاف کا منبع سلفِ صالحین، صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضور ﷺ کے سلسلے سے کٹ جانا ہے، خواہ اس سلسلے کی کسی ایک کڑی سے ہو۔ مسلمانوں میں اٹھنے والے تمام فتنے اسلام کا نعرہ لگا کر بلند ہوتے ہیں اور دین ہی کا لبادہ اوڑھ کر نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً خوارج نے سب سے پہلے حکومت الٰہیہ کا

www.urdueman.com

نعرہ لگا کر صحابہ رضی اللہ عنہم سے جدائی اختیار کی۔عقیدے کی گمراہی میں خود بھی مبتلا ہوئے اور عالمِ اسلام میں بھی خطرناک فتنہ برپا کیا۔اس طرح ماضی قریب میں ترقی اسلام اور ترقی المسلمین کے نام سے یورپی علوم اور تہذیب کی ترویج وترقی کے لئے جو تحریکیں چلیں ان کے نتیجہ میں دینی تربیت سے عاری ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خوارق اور معجزات کا انکار کرنے لگے۔اسی طرح مسلمانوں کو مختلف گمراہ تحریکوں میں بہلا پھسلا کر الجھا دیا اور ان کو علماء سے متنفر کرنے اور اسلاف سے کاٹ دینے کا فساد شروع کیا اس قسم کی سب گمراہ کن تحریکوں کی آواز تو اسلام ہی تھی لیکن روح اور مقصد اسلام سے عاری تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناسمجھ اور ناعاقبت اندیش لوگ دل فریب نعروں اور ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا کر راہِ راست سے دور ہوگئے اور سمجھ دار لوگ حقیقت پہچان کر ایک طرف محفوظ رہے۔دونوں طرف سے افراد کٹ کٹ کر ایک دوسرے کے مدِ مقابل جمع ہونے لگے اور یوں امتِ مسلمہ مرحومہ تفرقہ بازی اور فتنہ وفساد کا شکار ہوگئی۔

وہ حضرات جن کے سامنے گمراہ افراد اور فرقوں کی تاریخ موجود ہے۔خوب جانتے ہیں کہ سلفِ صالحین سے رابطہ کٹ جانے اور اعتماد اٹھ جانے کے بعد دین کو سمجھنے اور دین کی تشریح کرنے کے لئے کوئی حدود وحصار یا اصول وقواعد باقی نہیں رہتے۔قرآن وسنت کی ایسی بے سروپا اور لغو تفسیریں اور مضحکہ خیز تاویلیں سامنے آتی ہیں جو دین کی دھجیاں اڑانے کے مترادف ہوتی ہیں۔یہی گمراہی کی بنیاد ہوتی ہے۔پھر کہیں صحابہ رضی اللہ عنہم پر جھوٹے الزامات لگا کر اور کہیں حضور ﷺ کی احادیث کا انکار کر کے اپنی طرف سے دین کی تفصیلات گھڑ لی جاتی ہیں اور نئے گمراہ فرقوں کی ابتدا ہوتی ہے۔دورِ حاضر کے بعض نام نہاد مفکرین اور مضمون نگار حضور ﷺ کے سلسلے کے ساتھ لگے ہوئے سلف صالحین (جو کہ انقلاب آفرین صلاحیتوں اور کارناموں کے عظیم الشان نمونے قائم کر چکے ہیں) پر ایک طویل المیعاد فکری قحط اور ذہنی اور عملی تعطل کا الزام عائد کرتے ہیں اور اپنے زہریلے خیالات کو انقلاب اسلام اور ترقی دین

www.darulemaan.com

کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ گویا جو دین چودہ سو سال تک قائم و دائم، جاری و ساری رہا، اس کو اسلاف میں سے کوئی ٹھیک طرح سے سمجھا ہی نہیں تھا۔ اب آ کر یہ حضرات ہمیں صحیح دین، سمجھا رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ لوگ صرف اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کرنے والے ہیں۔ ان حضرات کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے سے ہی ایک رائے قائم کر لیتے ہیں پھر اس کو ثابت کرنے کیلئے قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کے عجیب و غریب مطالب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حضرات ایسی آیات اور احادیث بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے ان کی بے بنیاد رائے کی صریح نفی ہوتی ہے تو یہ لوگ قرآن مجید کی اس آیت کے مصداق بن کر خود پرستی اور شرک کے مرتکب ہوتے ہیں کہ:

﴿ارایت منِ اتخذ اِلٰهه هواه.......﴾

''کیا آپ نے اس شخص کو ملاحظہ فرمایا ہے جس نے اپنی خواہش نفسانی کو اپنا خدا بنالیا ہے....''

پس یہ لوگ اپنی خواہشات کو معبود بنا لیتے ہیں اور ان کا نفس ہی ان کے لئے قرآن بھی ہوتا ہے، حدیث بھی اور جو شخص حلال و حرام، جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے، نفس کی پیروی میں اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دے، وہ گویا اپنے نفس کو خدا بنا لیتا ہے۔ ائمہ اربعہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اتباع ہویٰ احکام دین میں قطعاً حرام ہے پس جو شخص اپنی نفسانی اغراض کو سامنے رکھ کر قرآن و حدیث میں اس کے لئے دلائل تلاش کرتا ہے وہ یقیناً متبع ہویٰ ہے۔ اگر اسے اتفاقاً کوئی سند مل بھی جائے لیکن بہر حال معاملہ تو علیم و خبیر اللہ کے سامنے ہی ہے جو دلوں کے بھید اور نیتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔

اسلاف کی فضیلت!

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

((خیر امتِی قرنِی ، ثم الذِین یلونهم ثم الذِین یلونهم))(رواه الاربعه)

''میری امت کا بہترین دور میرا ہے پھر اس کے بعد وہ لوگ جو ان سے ملتے ہیں پھر اس کے بعد

www.urdufreebooks.com

ان لوگوں کا جو ان سے ملتے ہیں۔''

یعنی تین دور، حضور ﷺ کا دور، صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور اور پھر تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کا دور بہترین ہیں اب اگر یہ نام نہاد فلسفی اور انشا پرداز یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین دین کو ٹھیک طرح نہیں سمجھے تھے تو پھر ان کی تمام فکری اور عملی کاوشیں مشکوک ہو جاتی ہیں اور دین کا سارا علمی ورثہ بے فائدہ اور بے معنی نظر آنے لگتا ہے۔ سلف پر الزامات ایسی عیاری سے پیش کئے جاتے ہیں کہ بظاہر کچھ اہم اور سنگین نظر نہیں آتے۔ لیکن اس کے اثرات دل ودماغ اور طرزِ فکر و عمل پر بہت گہرے اور دور رس ہو سکتے ہیں۔ آدمی یوں سوچنے لگتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے ماضی میں کچھ نہیں کیا تو مستقبل کے بارے میں ان سے کس فائدے کی توقع کی جا سکتی ہے، ان کے کارنامے بے قیمت اور ہم تک پہنچایا ہوا دین مشتبہ ہو جاتا۔ دین کی اصل تعلیمات شک وشبہ سے بالاتر نہیں رہتیں۔ ان نام نہاد مفکرین کی نحوست سے مغز و پوست، ظاہر و باطن کے فلسفے وجود میں آتے ہیں اور صاف اور سادہ، عملی دین ایک ناقابل فہم معمہ اور گورکھ دھندہ بن جاتا ہے اور دشمنانِ دین اور گمراہ لوگ اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور تفرقہ بازی کے لئے فضا سازگار ہو جاتی ہے۔

لیکن رحمۃ للعالمین اور ہادی برحق ﷺ نے ان فتنوں کے بارے میں پہلے ہی سے بتا دیا کہ علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو برا کہنے لگیں گے (جامع ترمذی) اور ابن ماجہ نے بروایت محمد بن المنکدر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب اس امت کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت کریں (اس وقت جس کسی نے کوئی حدیث چھپائی، اور اگلوں کی فضیلت نہ ظاہر کی) تو اس نے گویا اس (پوری) شریعت کو چھپایا جس کو اللہ جل شانہ نے اتارا ہے۔

گزشتہ صفحات میں محبت رسول ﷺ اور محبتِ اسلاف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مقصد یہ نہیں کہ کسی کی محبت کے نام پر ایسے افعال و اعمال اختیار کئے جائیں جن میں شرک یا شرک کا شائبہ ہو۔

www.Qarteeman.com

یاحبِ رسول کے نام پر رسول اللہ ﷺ کو کسی صفتِ الٰہی، علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ جل شانہ کے برابر کردیں۔ یا اسی طرح دوسری مشرکانہ حرکتیں اختیار کریں۔ حالانکہ ان ساری چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے خود منع فرمایا ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله))

''مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھا دیا (کہ اللہ کا بیٹا اور جز قرار دیا) میں (صرف) اللہ کا بندہ ہوں۔ لہٰذا مجھے (صرف) اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔''

ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ کا جز و مانیں یا آپ کی صفات میں اس قدر مبالغہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے برابر سمجھنے لگیں۔ البتہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

جیسا کہ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔ میں پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر پھٹے گی اور پہلا شخص ہوؤں گا جس کی شفاعت قبول ہوگی۔

اسی طرح حب رسول کی آڑ میں بری بدعات کو اختیار کرنا بھی عشق کے جھوٹے دعویٰ کی دلیل ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے سچی محبت ہو اور اس کی زندگی احکامِ الٰہی سے بغاوت اور معصیت کا نمونہ ہو۔ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کے باوجود اگر ہم خود کو رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنے والا سمجھیں تو ہم زبردست خود فریبی اور شیطانی دھوکے میں مبتلا ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے ایسے ہی مدعیان محبت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

www.darulemaan.com

تعصی الالہ وانت تزعم حبہ هذا لعمری فی الفعال بدیع لوکان حبك صادقا لاطعته ان المحب لمن یحب یطیع.

''اے محبت کے جھوٹے مدعی تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے عقل اور قیاس کے لحاظ سے یہ بات بہت ہی عجیب ہے۔ اگر تو دعویٰ محبت میں سچا ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا کیونکہ ہر محبّ اپنے محبوب کی بات کو دل وجان سے قبول کرتا ہے۔''

محبت کی علامات میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اقوال اور افعال کا اتباع کیا جائے۔ آپ ﷺ کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کی جائے اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان سے بچا جائے اور ہر حالت میں خواہ خوشی ہو یا غم آپ کے طریقوں کی پیروی کرے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قل اِن كنتم تحِبون الله فاتبِعونِی یحبِبكم الله﴾ (آلِ عمران:۳۱)

''آپ ﷺ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔''

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں اس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ امت مسلمہ کہیں شرک میں مبتلا نہ ہو جائے اور نصاریٰ وغیرہ کی طرح کسی کو درجہ الوہیت تک پہنچا کر اپنی دنیا وآخرت کو تباہ برباد نہ کر ڈالے اور اسی لئے ایسے حرام اور ناجائز اسباب ختم کرنا بھی بہت ضروری ہیں جس سے شرک کے لئے راہیں کھلتی ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آنحضرت ﷺ، آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ اور صلحائے امتؒ سے محبت پر ایمان کا دارومدار ہے۔ اس لئے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے نائبین سلفِ صالحین کے ساتھ سچی محبت، ان کے ادب واحترام کو شرک کہنا، یا ان حضرات کے اتباع میں جائز اور مباح افعال کو شرک سمجھنا یا غیر اللہ کی عبادت شمار کرنا، امت مسلمہ پر بہت بڑا ظلم ہے۔

www.urdueman.com

محبت بڑھانے کے جائز اسباب سے منع کرنا، رسول اللہ ﷺ اور ان کے نائبین الی یومنا ہذا کی محبت اور عظمت کے جذبہ کو کمزور اور ختم کرنا ہے اور امت مسلمہ میں انتشار و نفاق پیدا کر کے امت کو پارہ پارہ کرنا ہے۔

عصر حاضر کے نام نہاد توحید کے علمبرداروں کی توحید کو اگر دیکھا جائے تو ان کی توحید اسی میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے کہ دست بوسی، توسل، سماعِ موتیٰ وغیرہ کا شد و مد سے انکار کیا جائے۔ اور ان مسائل کے قائل حضرات کو بدعتی یا مشرک قرار دیا جائے (حالانکہ یہ اختلافی مسائل ایسے نہیں جن کے اقرار یا انکار پر کفر و ایمان کا دار و مدار ہو بلکہ دونوں طرف دلائل موجود ہیں جن میں سے بعض کا مفصل بیان پہلے گزر چکا) اس پر طرہ یہ کہ اسلاف کے آثار اور ان کی محبت کے جذبات کے مٹانے کو بزعمِ خویش توحید کا بول بالا کرنا سمجھتے ہیں اور شرک کے ذرائع اور اسباب کو ختم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف یہی نام نہاد موٗحدین، کفار و مشرکین جیسے روس و امریکہ کے آگے جھکنا، شاہوں کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھول جانا، عصبیت اور قوم پرستی میں آ کر دوسرے مسلمانوں کی تحقیر کرنا، الغرض یہ موٗحد نفس پرستی، شاہ پرستی، قوم پرستی اور مادی قوت کے سامنے سر افگندی میں مشرکین اقوام سے بازی لے گئے ہیں۔

دوسری طرف سچی محبت کو بدنام کرنے والے محبت کے داعی ہیں۔ جن کے ہاں محبت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ دست بوسی، قیام، توسل اور سماعِ موتیٰ وغیرہ کا اقرار کرنا ہے اور جو یہ نہ مانے وہ گمراہ، کافر اور گستاخ ہے۔ اس پر ظلم یہ کہ محبت و تعظیم کے پردے میں قبر پرستی، پیر پرستی اور ہر قسم کی بدعات اور خرافات کے رواج دینے کو اپنے خیال میں محبت بڑھانے کے اسباب سمجھتے ہیں۔ زبانی محبت کے یہ دعویدار، دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی اتباع، ان کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ایسے جی چراتے ہیں کہ منافقین و کفار کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔

ہر درد مند دل کو رونا میرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

آخر میں محبت کی اہمیت پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا حکیمانہ مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

''جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے وہاں اس پہلو پر اور زیادہ زور دینے اور اس کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات گرامی کے ساتھ صرف ضابطے اور قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی اور جذباتی تعلق اور ایسی گہری اور دائمی محبت مطلوب ہے جو جان و مال۔ اہل وعیال کی محبت پر فوقیت لے جائے۔''

آگے فرماتے ہیں:

''اس سلسلہ میں ان تمام مخالف اسباب، محرکات سے محفوظ اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے جو اس محبت کے ستونوں کو خشک یا اس کو کمزور کرتے ہیں، جذبات، احساساتِ محبت میں افسردگی، سنت پر عمل کرنے کے جذبہ میں کمزوری، اور آپ کو دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل سمجھنے میں تردد اور سیرت ﷺ، حدیث کے مطالعے سے روگردانی اور بے توجہی کا سبب بنتے ہیں۔ سورہ احزاب، سورہ حجرات، سورہ فتح وغیرہ قرآنی سورت کے غائر مطالعہ اور تشہد و نمازِ جنازہ میں درود و صلوۃ کی شمولیت پر غور و فکر، قرآن میں درود کی ترغیب اور درود کی فضیلت میں بکثرت وارد ہونے والی احادیث کا راز سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک مسلمان سے اس سے کچھ زیادہ مطلوب ہے جس کو صرف قانونی اور ضابطہ کا تعلق کہا جاتا ہے جو محض ظاہری اطاعت سے پورا ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ پاسِ ادب محبت اور تشکر و امتنان کا جذبہ بھی مطلوب ہے جس کے سرچشمے دل کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہوں، جو رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہو۔ اس پر محبتِ احترام اور احترام آمیز محبت کو قرآن نے تعزیر و توقیر، کے لفظ سے ادا کیا ہے۔''

www.darulfeman.com

صحابہ ﷺ کے چند واقعات کی طرف رہنمائی کر کے، آگے فرماتے ہیں:

''اس عشقِ رسول ﷺ سے ان علمائے راسخین، مصلحین، مجددین، زعماء قائدین کو وافر ملا۔ جنہوں نے دین کی حقیقی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا اور جن کے مقدر میں دین وملت کے احیاء وتجدید کا اہم کارنامہ انجام دینا تھا۔ اس پاک محبت کے بغیر جو شرعی احکام وآداب کے تابع واسوۂ صحابہ ﷺ کے اتباع وتقلید کے ساتھ ہو۔ اسوۂ رسول ﷺ کی کامل پیروی واتباع، جادۂ شریعت پر استواری، نفس کا دیانتدارانہ محاسبہ اور عسر ویسر اور طبعیت کی آمادگی وگرانی (منشط مکر) میں خدا ورسول ﷺ کی فرمانبرداری ممکن نہیں۔ یہی (کثیر النوع) نفسیاتی امراض کا علاج تزکیہ نفس اور اصلاحِ اخلاق کا مؤثر ذریعہ ہے۔ محبت کی ایک لہر خس وخاشاک کو بہالے جاتی ہے اور رگ وریشہ، جسم وجان میں اس طرح دوڑ جاتی اور جذب ہوجاتی ہے۔

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

مسلمان جو کبھی خدا اور رسول ﷺ کے عشق کی بدولت شعلہ بجوالہ تھے اس کے بغیر چوب خشک اور سرد کا خاکستر بنے ہوئے ہیں۔ (البلاغ صفر المظفر ۱۴۰۵ھ)

www.darulemaan.com

www.daruleeman.com

باب ہشتم

توحید!

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

فطرتی عقیدہ!

اللہ رب العزت کی توحید انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور توحید کا قائل ہوتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مالک و متصرف نہیں۔اس لئے تقاضاءِ فطرت اور جبلت سے مجبور ہو کر بے شمار بتوں اور دیوتاں کو مسجود و معبود ماننے والے بھی سخت مشکلات اور مصائب میں اپنے آپ کو بے سہارا پا کر دل کی گہرائیوں سے صرف ایک خدا ہی کو پکارتے ہیں۔لیکن تکالیف اور حوادث سے نجات پا کر پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں مشرکین بھی کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔اعتقادی اور عملی طور پر متعدد خداں کو ماننے کے باوجود فطرتی طور پر خالقِ کائنات اور بڑے خدا کو ایک ہی مانتے تھے۔ان کا یہ خیال تھا کہ یہ چھوٹے خدا اس کے قائم مقام ہیں یا اس کی صفات کے نمائندے ہیں۔یا دنیا کے کاروبار کو اوروں میں تقسیم کر کے بڑا خدا آرام کرتا ہے یا پھر چھوٹے خداؤں کو بڑے خدا کے اجزا قرار دیتے تھے۔اس لئے وہ عبادات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو بھی شریک کرتے تھے جس کی وجہ سے توحید خالص سے محروم ہو کر دنیا و آخرت کی تباہی و بربادی کما کر لے گئے۔

دینِ اسلام نے توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی العبادات، الغرض توحید کو ایسے مکمل، واضح اور صاف ترین انداز میں پیش کیا ہے کہ عقولِ انسانی کو ہر قسم کی خرافات اور اوہام کے زنگ

www.ahlehaq.com

سے محفوظ اور پاک رکھتا ہے۔

اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ شانہ کو کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم ہے اسی طرح اس پر قدرت بھی ہے اور کائنات کی کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی، نہ اس کے علم سے باہر ہے اور نہ اس کے حکم، قضا و قدر سے آزاد۔

اللہ جل شانہ کا علم، اس کا ارادہ، اس کی مشیّت، اس کی قدرت اور اسکی تکوین آسمان و زمین کی ایک ایک چیز پر حاوی اور کائنات کے ایک ایک ذرے کو محیط ہے۔ ساری کائنات اس کے قید و بند میں ہے۔ اگر کہیں کبھی ایک پتہ بھی ہل جاتا ہے تو وہ اس کے علم و ارادہ اور حکم کے بغیر نہ گر سکتا ہے اور نہ ہل سکتا ہے۔ وہ کائنات کے چلانے میں کسی کی معاونت کا محتاج نہیں اور نہ اس کے نظام و تدبیر میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ نہ اس نے کائنات میں تصرف کا اختیار کسی کو دیا ہے اور نہ وہ کسی کو خدائی اختیارات دیتے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ مخلوق چاہے زمینی ہو یا آسمانی، جامد ہو مائع الغرض جیسی بھی ہو کسی کو بھی تصرف، عزت، ذلت دینے والا، مارنے اور جلانے والا، صحت و قوت دینے والا نہ تسلیم کریں اور تمام صفاتِ کمال سے صرف خدائے واحد و لاشریک ہی متصف ہے۔ اس کی حکمرانی نہ صرف کائنات کے ذرے ذرے پر ہے بلکہ تمام مخلوقات اور انسانوں کے دلوں، ان کے جذبات و احساسات، روح و شعور اور لطیف ترین عناصر سب اس کے کامل و مکمل قبضۂ قدرت میں ہیں اور قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان نسبتوں کا قطعی انکار کریں جو توحیدِ خالص کے منافی ہوں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو کسی سے زوجیت کا رشتہ ہے نہ جزیت کا نہ ولدیت اور نہ ہی اخوت کا تعلق ہے۔ غرض جس طرح دین اسلام نے توحید کے مسئلے کو ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک وصاف کر کے اللہ تعالیٰ کو تجسم سے وراٗالوراٗ بتلا کر توحید کامل کی طرف دعوت دی ہے۔ اسی طرح اس نے توحید کے فلسفیانہ عقیدے کو جو اس بحث میں حد سے بڑھ کر صفاتِ الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے، بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رؤیت کے، سمیع ہے بغیر سمع وغیرہ وغیرہ، کو بھی باطل ثابت

کیا ہے۔فلسفیانہ عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا واحد ایک ایسی ہستی ہے جس کے لئے تعطل لازم وضروری بن جاتا ہے۔قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ سمیع اور بصیر ہے۔سنتا ہے دیکھتا ہے۔ بلاشبہ وہ قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہے رصفات رحم وکرم کے ساتھ رحیم وکریم ہے البتہ اس کی صفات جیسے سمع وبصر کے ساتھ مخلوق کے دیکھنے اور سننے کا، دور کا تعلق یا مشابہت بھی نہیں۔جس طرح وہ اپنی ذات میں ممتاز اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے۔

﴿لیس کمثلِہ شیء وھو السمِیع البصیر﴾

''نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی اور وہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی۔''

مؤمن کا حال!

مؤمن کی نگاہ ہر حال میں ذاتِ باری تعالیٰ پر ہوتی ہے۔تکلیف ہو یا راحت، اسی پر توکل کرتا ہے۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور اللہ جل شانہ مسبب الاسباب ہے۔انہوں نے ساری اشیاء میں اسباب واثرات خود رکھ دیئے ہیں۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان اسباب پر تکیہ واعتماد کر کے موثر حقیقی سے نگاہ ہرگز نہ ہٹائیں۔کیونکہ ہر قسم کے حوادث اور مصائب میں کام بنانے والا وہی اللہ رب العزت ہے۔ پس ہر دکھ درد اور تکلیف میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے حدیث شریف میں آتا ہے:

((یسئل احد کم ربہ حاجتہ حتی شع نعلہ اذا انقطع فانہ لم یتیسر لم یتیسر))

''چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی حاجت خدا ہی سے مانگے یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی، جب وہ ٹوٹ جائے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر آسانی نہ فرماویں تو جوتے کا تسمہ میسر نہیں آسکتا۔''

اسی پر بس نہیں۔دینِ اسلام میں معاملات میں بھی بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی اعمال واقوال کا مقصد حکم الٰہی کی بجا آوری ہے۔اگر ایک باپ اپنے بیٹے پر خرچ کرتا ہے یا ایک بیٹا اپنے باپ کی تعظیم وتکریم کرتا ہے تو نیت یہ ہونی چاہئے کہ اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے یہ کام کیا

www.darulfeman.com

جارہا ہے اور یہی نیت سب دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلق یا محبت اور تعظیم اور زندگی کے دوسرے معاملات میں جاری وساری رکھنی چاہیے۔ اگر ایسے اعمال سے اپنے نفس کو بھی کچھ حصہ ضرور ملے گا لیکن ذاتی حظِ نفس کا حصول ہرگز مراد ومقصود نہیں ہونا چاہئے۔

بلاشبہ ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں انبیاء علیہم السلام اصحابِ رسول اور صلحاءِ امت سے محبت کیا کریں اور اللہ تعالیٰ کے سب شعائر کی تعظیم وتکریم کریں اور ان کی ادنیٰ گستاخی اور بے ادبی سے بچیں، لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا گیا کہ کسی بھی مخلوق کی بندگی نہ کریں اور نہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں کسی کو شریک کریں اور نہ کسی بزرگ، عالم یہاں تک کہ پیغمبر کے ساتھ وہ رویہ اور معاملہ اختیار نہ کریں جو صرف اور صرف اللہ رب العزت کا حق ہے اور اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توحید اور جذبۂ جہاد!

یہی توحید دین اسلام کی اصل اور اساس ہے جس پر ہمارے دونوں جہانوں کی فلاح ونجاح کا دارومدار ہے۔ یہی ہماری آخرت کی کامیابی کی ضامن ہے۔ اس کے بغیر انسان عذابِ جہنم سے نہیں بچ سکتا اور نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا مستحق ہوسکتا ہے۔ یہی وہ ایمان تھا جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور عظمت سے معمور کر رکھا تھا۔ مخلوق کا کمال وجمال دنیا کی ظاہری چمک دمک اور شان وشوکت ان کی نظروں میں ہیچ تھی۔ بادشاہوں کا جاہ وحشم اور ان کے درباروں کی زیب وزینت ان کی نگاہوں میں مٹی کے بے جان مجسموں اور ان کے رنگ وروغن سے زیادہ نہ تھی ایک صحابی کفار کے ساٹھ ہزار لشکر کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہوتا تھا اسے معلوم تھا کہ کفار کے دل محبت اور یادِ الٰہی سے خالی ہیں اور یہ یقین تھا کہ جس دل میں ذکر الٰہی نہ ہو وہ تو مردہ ہے۔ ان کی اولاد کفار کے مقابلے میں خون میں لت پت، تڑپتے ہوئے شہید ہوتے تو وہ خوش ہوتے اور اس پر فخر کرتے اور جب کفار کے ساتھ لڑنے میں ان کی روح نکلتی تو چیخ مار کر پکارتے کہ ہم کامیاب ہوگئے۔

www.darulemaan.com

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم وتکریم اور محبت کرنے والے، اپنے دوسرے بھائیوں کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے والے، ایک بھائی کی تکلیف پر سب بے آرام ہونے والے تھے، اس کے برعکس اللہ ہی کے لئے اس کے دشمنوں کفار ومشرکین سے شدید بغض اور نفرت رکھنے والے تھے۔ ان کی تمام تر نفرت دشمنانِ دین اور اغیار کے خلاف استعمال ہوتی تھی جب کہ خود آپس میں شیر وشکر تھے اللہ عالی کی حاکمیتِ اعلی اور اقتدارِ مطلق کے تقاضے اور مطالبے نہ صرف سچے دل اور سچی زبان سے قبول کرنے والے تھے بلکہ عملی زندگی سے انہیں ثابت کرنے والے اور یقین کامل وصادق کا نمونہ پیش کرنے والے تھے۔

توحید کے ثمرات!

بلاشبہ اگر کوئی توحیدِ اسلام کو سچے دل سے اپنائے اور اپنی تمام اغراض، نفع ونقصان کا مرکز صرف ایک ذات رب العالمین کو قرار دے اور عملاً بھی اپنے آپ کو صرف اللہ وحدہ لاشریک کے سپرد کردے اور اللہ ورسول ﷺ کے احکام کے سوا کسی اور کے احکام پر اپنی زندگی کا دارومدار نہ رکھے تو اس کے دل پر اخبات وخشوع، استقلال، توکل اور اخلاص کی وہ انتہائی قوت آجائے گی اور وہ ہر مخلوق سے بے نیاز ایک نڈر مجاہد بن جائے گا۔ اور وہ کسی دجال ومکار اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ رہے گا اور دنیاوی مصائب وتکالیف سے اس پر گھبراہٹ اور بے چینی طاری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے وہ دل میں ایک سرور محسوس کرے گا۔

کیونکہ جس شخص کو اس بات پر یقین ہو کہ اس کا خالق ومالک ایک قادر مطلق ذات ہے جو انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے رجس قسم کی خیر ورحمت بھی اس کو پہنچتی ہے محض اللہ جل شانہ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اسکے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کی قسمت بننا اور بگڑنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں اور وہی اسے ہر قسم کے ضرر

www.darfeeman.com

سے بچانے والا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو غیر اللہ چاہے کوئی بھی ہو اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور مخلوق کیسی ہی کیوں نہ ہو اسے کوئی چین اور سکون نہیں دے سکتی ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اسے راحت واطمینان دے سکتی ہے اور یہ عقیدہ اس کے دل ودماغ پر چھا کر اس کا حال بن جائے تو وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اسی کا محتاج رہے گا، در، در کی بھیک مانگنے اور مخلوق کی عملی وفکری ہر قسم کی پرستش سے بچ جائے گا۔ دنیا ہی میں اسے جنت کا مزہ ملے گا اور وہ ساری دنیا سے بے نیاز خوف وخطر سے بالاتر زندگی گزارے گا اس کا دل دنیا کی کسی قوت سے نہیں گھبرائے گا۔ یہی عقیدہ اس کو وطنیت، رنگ ونسل کی برتری، جسمانی طاقت اور دولت کے غرور، خودغرضی، نفس پرستی، تن پروری، حسد وبغض اور دیگر رذائل، خرافات واوہام سے بالکل پاک وصاف کردے گا۔ دنیاوی مال ومتاع سے اگرچہ اس کا گھر خالی ہوگا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے اطمینان واستغنا کا نور چھلکتا ہوگا اور پیشانی میں قناعت اور سکون کی چمک ہوگی۔ یہ خدا کا ہوگا اور خدا اس کا ہوگا۔

افسوس کہ آج اغیار تو رہنے دیں، اپنے بھی اس توحیدِ مطلوب سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو بعض اہل توحید ہوتے ہوئے ادب واحترام کی حدود سے تجاوز کر کے مخلوق کی عبادت اور ان کو سجدہ، رکوع کرنے لگے ہیں۔ دوسری طرف توحید کے دعوے دار اسلاف کی عظمت وشان گھٹانے اور ان کی بے ادبی اور گستاخی اور ان پر سے اعتماد ختم کرنے ہی کو توحید سمجھ کر امت میں نفاق اور افتراق کے تخم بو رہے ہیں۔

کاش ہر دو فریق افراط وتفریط سے ہٹ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے اسلاف کی طرح ایک اللہ پر ہر حال میں دل کی نگاہ جمائے قولی محبت [1] اور قولی توحید کی بجائے محبت میں رنگی ہوئی عملی توحید کو اپناتے تو پھر

---

[1] قولی توحید اور قولی محبت سے غرض یہاں توحید اور محبت کا صرف زبانی جمع خرچ مراد ہے جو کہ صرف بلند دعوؤں کی حد سے متجاوز نہ ہو۔

www.cafurqan.com

دیکھتے کے وہ کون سی طاقت ہے جو کسی ایک مسلمان کو بھی ترچھی نگاہ سے دیکھے۔

ہمیں جاننا چاہیے کہ ہمارے اسلاف کی عظیم فتوحات اور کامیابیاں صرف توحید اور دینِ اسلام کو پوری طرح اپنانے میں مضمر تھیں۔ وہ ہماری طرح صرف محبت یا توحید کے نام پر شیریں اور دلچسپ تقریروں پر اکتفا کرنے والے نہیں تھے، اللہ نہ کرے کہ ہم کہیں حضور ﷺ کی اس پیشین گوئی ''یفتح القول وتحبکس العمل'' (ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں تقریریں اور باتیں تو کھل جائیں گی اور عمل بند ہو جائے گا) کے مصداق بن جائیں۔

اللھم ارِناالحق حقا و ارزقنا اتباعه وارِناالبا طِل باطِلا و ارزقنا اجتِنابه ربنا تقبل مِنآ اِنك انت السمِیع العلِیم۔

والحمد لِلهِ ربِ العلمِین والصلوة والسلام علی خاتمِ النبِیین وعلی ا لِه واصحابِه اجمعِین۔

مختارالدین

کربوغہ شریف

شعبان:۱۴۰۶ ۲۳اپریل۱۹۸۶

www.darulleeman.com